ہدیہ بارگاہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

بسمہ تعالیٰ

فتنہ انکار حدیث

مؤلفہ

امام المتکلمین و محققین علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی قدس اللہ سرہ

ناشر

مکتبہ رازی ۱۵ شہاب مینشن محمد بن قاسم روڈ

کراچی ۱

فتنہ انکارِ حدیث

اور

مسئلہ قربانی

مئولف: علامہ ایوب دہلویؒ

بشکریہ: جناب ہاشمی صاحب

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

انکارِ حدیث کیوں؟

(منکرینِ کے جوابات)

"فتنۂ انکارِ حدیث"

از
امام المتکلمین و محققین علامہ حافظ
محمد ایوب صاحب دہلوی قدس اللہ سرہٗ

بلا قیمت

مکتبہ رازی ۱۵ شہاب مینشن محمد بن قاسم روڈ کراچی (پاکستان)

اداریہ

زیر نظر کتاب کی افادیت کا اندازہ ناظرین کو خود بخود ہو جائے گا۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیش بہا مضامین کا ایک بڑا ذخیرہ ٹیپ ریکارڈ کی شکل میں بحمد اللہ محفوظ ہے۔ اس ذخیرے میں متعدد عنوانات پر بحث کی گئی ہے اور بڑے نادر مضامین آ گئے ہیں۔ یہ ذخیرہ حاجی محمد صدیق صاحب طیبی سینٹر شاہراہ لیاقت کراچی کے پاس محفوظ ہے اور اس کی مجموعی تعداد تین سو تقریریں ہیں جو ٹیپوں پر ریکارڈ کی ہوئی ہیں۔ اہل خیر حضرات جن کو دینی علوم کی اشاعت کا ذوق ہو درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ان بیش بہا مضامین کی اشاعت کا انتظام اپنے ذمے لیں۔ اور ثواب دارین حاصل کریں۔ قوم کی بڑی بدقسمتی ہوگی اگر ایسے فاضل علامہ کے افکار اور خیالات عوام الناس تک نہ پہنچ سکیں۔ اور یہ ذخیرہ تلف ہو جائے۔

"ادارہ"

(عرفان آزاد سپیر آرٹ پریس،

مکتبہ رازی ۵ اشہاب مینشن محمد بن قاسم روڈ کراچی ۱

اس کتاب میں

۱۔ وحی کی کتنی صورتیں ہیں اور کیا کتاب الہٰی کے علاوہ بھی وحی ہو سکتی ہے یا نہیں؟

۲۔ حدیث رسولؐ دین میں حجت ہے یا نہیں؟

۳۔ احادیث رسول کا جو معتبر مجموعہ ہمارے پاس موجود ہے وہ یقینی ہے یا ظنی؟

۴۔ ظن شرعی حجت ہے یا نہیں؟

۵۔ اعمال شرعیہ کی مثالیں۔

۶۔ احادیث مسلمہ واجب العمل ہیں یا نہیں؟

۷۔ منکرین احادیث کے جوابات۔

۸۔ منکرین احادیث کے ترجمے کی غلطیاں۔

۹۔ طلوع اسلام کے سوالات کے جوابات۔

قرآن کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے

ہمارا مقصد

خالص علمی سطح پر دلائل و براہین کے ساتھ مخالفین اسلام کے پھیلائے ہوئے مغالطوں کا جواب دینا اور اسلامی عقائد و تعلیمات کی حقیقی روح سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف

فتنہ انکارِ حدیث دورِ حاضرہ کے فتنوں میں سے ایک بڑا فتنہ ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ اس کا موقفِ علمی زیادہ مستحکم و مضبوط ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اپنے مقصد کے اعتبار سے یہ فتنہ دہریت اور کمیونزم کا ہم آہنگ ہے۔ اس کا مقصد بجز دین کو فنا کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ دہریت عقلِ انسانی کو دین پر غالب کرتی ہے اور کمیونزم احتیاجِ بشری کو۔ منکرینِ حدیث جن کو کتابِ آسمانی کے انکار کی جرأت تو نہیں ہوئی، لیکن انھوں نے کتاب اللہ کو اس کے حامل کی تفسیر اور تشریح سے محروم کر کے اسے بے اثر بنانے کا مذموم منصوبہ تیار کیا اور حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کا جو مکمل سامان کیا تھا اس کو درہم برہم کرنا چاہا۔ حق تعالیٰ نے صرف کتاب نازل کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان اوصاف کے ساتھ مبعوث فرمایا۔

"هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" (پارہ قد سمع اللہ ۔ الجمعہ)

تاکہ وہ تدریجی طور پر حسبِ ضرورت کتاب کی ایک ایک آیت کی توضیح و تشریح و نیز عملی تفسیر امت کے سامنے پیش فرمائیں اور اس کی صحیح ترتیب متعین فرمائیں اور جن مسائل کا کتاب میں اجمالی ذکر ہے یا کوئی جزوی بات بیان نہیں کی گئی، اس کی تفصیل و تشریح فرمادیں اور جزئیات کو بیان فرما کر تکمیلِ دین کا فریضہ انجام دیں۔ منکرینِ حدیث (جن کا مرکز ادارہ طلوعِ اسلام لاہور ہے) اس گمراہی میں مبتلا ہیں یا دوسروں کو یہ کہہ کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں کہ واجب الاتباع محض وحی الٰہی ہے اور وحی صرف کتاب اللہ میں منحصر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت آپ کی زندگی تک محض مرکزِ ملت ہونے کی وجہ سے تھی۔ آج مرکزِ ملت کی عدم موجودگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پابندی غیر ضروری ہے ان کا قول یہ بھی ہے کہ:

"اطاعت صرف خدا کی ہو سکتی ہے، کسی انسان کی نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ رسول بھی اپنی اطاعت کسی سے نہیں کرا سکتا۔ قرآن رسولؐ کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی شئے کو حرام قرار دیدے۔"

حالانکہ قرآن شریف میں جا بجا "اَطِيعُوا اللّٰهَ" کے ساتھ "اَطِيعُوا الرَّسُولَ" کا حکم فرمایا گیا، اور ایک جگہ تو یہ ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

"مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ"

(جس نے رسول کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی)

منکرینِ حدیث کا مغالطہ نہایت شدید اور انتہائی گمراہی کا باعث ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ مغالطہ قرآن فہمی کے دعوے کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ صحیح عقیدہ وہ ہے جس کی ترجمانی علامہ اقبالؒ نے کی ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ضرورت ہے کہ اس حقیقت کو اہلِ علم اور عامۃ المسلمین کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ وہ اس فتنہ سے محفوظ رہیں۔ اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے اور بنیادی باتیں بطور سوالات رکھ کر ہمیں اس پر خالص علمی انداز میں بحث کرنی چاہیئے۔

وہ بنیادی سوالات حسبِ ذیل ہو سکتے ہیں:۔

1. وحی کی کتنی صورتیں ہیں، اور کیا کتابِ الٰہی کے علاوہ بھی وحی ہو سکتی ہے یا نہیں؟
2. حدیثِ رسولؐ فی نفسہٖ دین میں حجت ہے یا نہیں؟
3. احادیثِ رسول کا جو معتبر مجموعہ ہمارے پاس ہے وہ یقینی ہے یا ظنی؟

۴ ظنِ شرعی حُجّت ہے یا نہیں ؟

۵ احادیث مسلّمہ واجب العمل ہیں یا نہیں ؟

۶ منکرینِ احادیث کے جوابات

۷ منکرینِ احادیث کے ترجمے کی غلطی

۸ طلوعِ اسلام (جون ۱۹۵۶ء) کے باب المراسلات کے جوابات۔

ان سوالات پر حضرت العلّامہ محمد ایوب صاحب مدظلہ العالی نے قرآنی دلائل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

امید ہے کہ حضرت علّامہ کے جواب سے ہر طالبِ حق کی تشفی ہو جائے گی اور بے شمار حضرات کا تذبذب اور شکوک و شبہات رفع ہو جائیں گے۔

حضرت علّامہ نے بدلائل عقلی و نقلی ثابت کیا ہے کہ ظن عقلاً اور شرعاً دونوں طرح حُجّت ہے اور موجب عمل ہے۔ گو موجبِ ایمان نہیں۔ کیونکہ موجبِ ایمان تو یقینی ہی ہے اس لئے اصول یہ ٹھہرا کہ ظن پر عمل ہوگا اور یقین پر ایمان کا دار و مدار ہے۔ حجیت ظن کے سلسلہ میں بے شمار مغالطے شرعی اور منطقی اصطلاحات کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے حضرتِ علّامہ نے ظن اور یقین اور متعلقہ اصطلاحات کی وضاحت فرما دی ہے تاکہ ان کا صحیح مفہوم ذہن نشین ہو جائے۔ اسی احتیاط کے پیشِ نظر یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ ایک ظن تو یقین کا مقابل ہے جو علم کی ایک قسم ہے۔ مثلاً ظنی علم جو مقابل ہے یقینی علم کا۔ دوسرا ظن عمل کی ایک قسم ہے جس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سُوءِ ظن، اور دوسرا حُسنِ ظن، سُوءِ ظن سے اللہ تعالیٰ نے بچنے کو فرمایا ہے، اور حُسنِ ظن پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس ظن کو حضرت علّامہ نے حُجّت قرار دیا ہے وہ ظن وہ ہے جو یقین کا مقابل ہے اور قسم علم ہے۔ حُسنِ ظن اور سُوءِ ظن پر بحث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضرت مولانا کا طرزِ بیان خاص علمی اور تحقیقی ہے۔ اس میں دورِ جدید کی انشا

پردازی اور الفاظ کی سحر کاری نہ ملے گی، لیکن جویندگانِ حق کو ہدایت کی روشنی اور حقیقت کا نور ہر در نظر آئے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو فہم سلیم عطا فرمائے —— اور وَسْوَاسِ الْخَنَّاس کے شر سے محفوظ رکھے۔ آمین

ادارہ

مولوی عبد الماجد صاحب دریاآبادی کا تبصرہ

صدق جدید لکھنؤ ۱۶ مئی ۱۹۵۸ء مطابق ۲۶ شوال المکرم ۱۳۷۷ھ

منکرین حدیث کے بہت سے جوابات اور اچھے اچھے جوابات مختلف عالموں، فاضلوں، اہل خیر و نظر نے دیئے ہیں لیکن یہ جوابات اپنی منطقی گرفتوں کے لحاظ سے ان سب سے ممتاز و برتر ہے۔ مصنف کی نظر ایک تو ماشاء اللہ قرآن و حدیث دونوں پر گہری ہے اور پھر معقولات کے بھی امام فن معلوم ہوتے ہیں اس لئے قدرتاً انہوں نے منکرین حدیث کی ایک ایک دلیل کو لے کر خوب ہی اس پر جرح کی ہے اور بغیر کسی شخصیت کو درمیان میں لائے منکرین کے محض دلائل کو لے کر ان کو توڑ کے بلکہ چکنا چور کر کے رکھ دیا ہے۔ حجیت حدیث خبر احاد کی شرعی اہمیت ظن کی قسمیں وحی کی مختلف صورتیں اور اسی قسم کے عنوانات پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور چھوٹے بڑے ہر اعتراض کا مسکت ہی نہیں شافی۔ مسکن تشفی بخش جواب دے دیا ہے۔

حضرت مولانا مولوی حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس دارِ فانی سے رحلت پا گئے ہیں۔ تمام اہل نظر حضرات سے استدعا ہے کہ حضرت کے لئے ضرور ایصالِ ثواب فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ۝

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱- وحی کی کتنی صورتیں ہیں

اور کیا کتابِ الٰہی کے علاوہ بھی وحی ہو سکتی ہے یا نہیں؟

سوال: کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف کے علاوہ بھی وحی کی جاتی تھی یا وحی صرف کتاب اللہ میں منحصر ہے۔ کیا ہر وہ نبی جس پر کتاب نازل ہوئی علاوہ کتاب کے اس پر وحی نازل کی گئی یا نہیں۔؟

جواب: ہر نبی پر وحی آئی اور ہر نبی صاحبِ کتاب پر علاوہ کتاب کے بھی وحی آئی۔ بالخصوص ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر علاوہ قرآن شریف کے بارہا بکثرت وحی آئی۔

ثبوت: اس بات کا ثبوت کہ وحی کتاب کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ کتاب کے علاوہ بھی ہر صاحبِ کتاب نبی پر وحی آتی رہی یہ ہے کہ:۔

ہر نبی صاحبِ کتاب نہیں ہے مگر صاحبِ وحی ہے۔ یعنی نبی وحی کے بغیر نہیں ہو سکتا اور کتاب کے بغیر نبی ہو سکتا ہے۔ اب اگر وحی کتاب کے ساتھ مختص ہو گی تو ہر نبی کو صاحبِ کتاب ہونا چاہیئے۔ حالانکہ اس بات پر اجماع ہے کہ ہر نبی صاحبِ کتاب نہیں ہے اور صاحبِ وحی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ۔" (فمن اظلم، حٰمٓ۔ السجدۃ) کہہ دے کہ میں تمہارے جیسا آدمی ہوں۔ یعنی بشریت میں تم جیسا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ نبی غیر نبی سے صرف وحی میں ممتاز ہے۔ بغیر وحی کے نبی بھی نہیں سکتا۔ وحی کیا چیز ہے۔؟ اللہ کا بشر سے کلام کرنا وحی ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے فرمایا:۔ "مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ۔" (الیہ یرد۔ شوریٰ) یعنی اللہ تعالیٰ بشر سے صرف تین طریقوں سے کلام کرتا ہے:۔ (۱) وحی سے (۲) پردہ کے پیچھے سے، (۳) یا ایک رسول (فرشتہ) کو بھیجتا ہے۔ وہ اس کی اجازت سے اس کی مشیت کے موافق اس انسان پر وحی کر دیتا ہے۔ یہ تین طریقے ہیں وحی کے اور تینوں وحی ہیں "إِلَّا وَحْيًا" میں وحی صاف ہے۔ "مِن وَرَاءِ حِجَابٍ" جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا۔ یہ بھی وحی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: "وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ" (قال الم، طٰہٰ) (میں نے تجھ کو پسند کر لیا تو سن جو وحی کی جا رہی ہے)

حضرت موسیٰؑ سے جو کلام کیا اس کو اللہ نے وحی سے تعبیر کیا۔ "أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ" میں وحی موجود ہے۔ الغرض اللہ تعالیٰ کا بشر سے کلام کرنا وحی ہے اور جس پر وحی ہو وہ نبی ہے۔ کیونکہ فرق نبی اور غیر نبی کا صرف وحی ہے

ہم کو یہ سمجھانا ہے کہ قرآن شریف جبریل روح الامین لے کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ" قرآن کو روح الامین لے کر آئے ہیں۔ "فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ" جبرئیل نے تیرے دل پر قرآن اتارا۔ اس سے صاف واضح ہو گیا کہ "يُرْسِلَ رَسُولًا" میں جس وحی کی طرف اشارہ ہے وہ قرآن مجید ہے۔ وہ رسول اور فرشتہ جو یہ اذنِ الٰہی وحی کرتا ہے وہ صرف قرآن ہے اور واضح ہو گیا کہ وحی کا انحصار قرآن ہی میں نہیں ہے۔ بلکہ قرآن سے علیحدہ ۲ دو وحیاں اور ہیں، جن کی طرف إِلَّا وَحْيًا اور أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ میں اشارہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحی کی تین قسمیں بتائیں اور قرآن شریف تیسری قسم یعنی "أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا" میں شامل ہے إِلَّا وَحْيًا اور أَوْ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ یہ دونوں قرآن کے علاوہ ہیں

کیونکہ قرآن کو روح الامین (جن کو آیت میں رسول سے تعبیر فرمایا ہے) لے کر آئے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ وحی کا انحصار صرف قرآن شریف میں نہیں ہے بلکہ وحی، علاوہ قرآن شریف کے ان دو طریقوں پر (یعنے اِلَّا وَحْيًا اور اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ) بھی ہوتی ہے۔ اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ انبیاء سابقین پر وحی ہوئی اور وہ وحی کتاب نہیں تھی۔

حضرت آدمؑ سے اللہ تعالےٰ نے کلام کیا۔ "قُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ" (الٓمٓ۔ البقرۃ) (اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو سہو) "يَا آدَمُ اَنْبِئْهُمْ" (اے آدم ان کو یعنی فرشتوں کو ان اشیاء کے نام بتا دے) وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا اَلَمْ اَنْهَكُمَا" (ولواننا۔ الاعراف) ان کے رب نے ان کو پکارا کہ میں نے تم کو منع کیا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے آدمؑ سے بار بار کلام کیا اور یہ کلام کتاب نہ تھا۔

حضرت نوحؑ پر وحی کی وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ۔" (ومامن دابۃ ۔ ھود) نوح کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے اب کوئی اور ایمان نہیں لائے گا۔ جو ایمان لانے والے تھے وہ لا چکے۔" فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ" جب تو اور تیرے ساتھی کشتی پر سوار ہو جائیں۔" يَا نُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ" (ومامن دابۃ ۔ ھود) اے نوحؑ وہ (یعنی تیرا بیٹا) تیرے اہل میں سے ہے ہی نہیں۔

الغرض متعدد کلام حضرت نوحؑ سے ہوئے، یہ سب وحی تھے اور کتاب نہ تھے کیونکہ مایوسی کے وقت، ڈوبنے کے وقت اور نجات پانے کے وقت کتاب کی ضرورت نہیں تھی۔ کتاب کا نزول بشارت اور انذار اور رفع اختلاف کے لئے ہوتا ہے۔ وہ اس وقت مقصود نہ تھا۔ حضرت ابراہیمؑ پر وحی ہوئی :-

" يَا اِبْرَاهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا" (ومامن دابۃ ۔ ھود) اے ابراہیمؑ چھوڑ بھی اس خیال کو۔ یہ وحی تھی اور کتاب نہ تھی۔" تِلْكَ حُجَّتُنَا اٰتَيْنَاهَا اِبْرَاهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ" (واذا سمعوا۔ الانعام) حضرت ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلہ کے لئے یہ حجت ہم نے دی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے کواکب اور شمس و قمر کے غروب اور غائب ہونے سے ان کے حدوث پر استدلال کیا۔ اس کو اللہ تعالےٰ نے اپنا لیا اور کہا کہ یہ حجت ہم نے ابراہیم کو سکھائی تھی۔ یہ وحی تو تھی مگر کتاب نہ تھی۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا "اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ" (وما ابری ۔ یوسف) مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے حاضرین نے کہا آپ تو وہی پرانے خیالات میں ہیں۔ پھر جس وقت آپ بینا ہو گئے تو فرمایا: "اِنِّيْ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" مجھے اللہ کی طرف سے وہ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو تمہیں معلوم نہیں ہوتیں۔ بس یہی وحی ہے مگر کتاب نہیں ہے۔ کتاب ہوتی تو بیٹوں کو اور تمام حاضرین کو معلوم ہو جاتی۔ اس کی تو تبلیغ فرض تھی۔ حضرت یوسفؑ پر وحی ہوئی۔" وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا" ہم نے یوسفؑ کو وحی کی کہ تو ان کی اس غلطی پر ان کو متنبہ کرے گا چنانچہ انہوں نے ان کو متنبہ کیا هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ" (وما ابری ۔ یوسف) تمہیں کچھ پتہ ہے کہ یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ تم نے کیسا (برا) برتاؤ کیا تھا۔ بہرحال یہ وحی کنوئیں میں ڈالتے وقت ہوئی تھی اور یہ وحی کتاب نہ تھی۔ حضرت موسیٰؑ کو طور پر وحی ہوئی "يَا مُوْسٰى اِنِّيْ اَنَا اللّٰهُ" (امن خلق ۔ القصص) اے موسیٰ میں ہی معبود ہوں۔ یہ وحی تھی کیونکہ فرمایا فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى۔ سن جو وحی (تیری طرف) کی جارہی ہے۔ بہرحال طور کا کلام وحی ہے مگر کتاب نہیں۔" وَاَوْحَيْنَا اِلٰى مُوْسٰى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ" (قال الملا۔ الاعراف) ہم نے موسیٰ کو وحی بھیجی کہ اپنا عصا پھینک دے۔ یہ وحی ہے اور کتاب نہیں ہے۔ کیونکہ توریت ان وحیوں کے بہت عرصہ بعد نازل کی گئی تھی۔" وَاَوْحَيْنَا

إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي " (وقال الذین۔ الشعراء ع) ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا۔ یہ وحی ہے اور کتاب نہیں ہے۔ الغرض متعدد وحیاں ان حضرات کو ہوئیں اور یہ وحیاں کتابیں نہ تھیں۔ حضرت لوطؑ سے ملائکہ نے کہا " يَا لُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ اے لوط ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ یہ وحی تھی کتاب نہ تھی۔ کیونکہ عذاب کے وقت کتاب کیسی؟ عذاب کے وقت کتاب بے سود چیز ہے۔ بنی اسرائیل کے نبی نے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے۔" وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا " (سیقول۔ البقرہ) یہ وحی ہے کتاب نہیں ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پر وحی ہوئی: " فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ " ہم نے اس فیصلہ کو سلیمان کو سمجھا دیا۔ یہ وحی تھی کتاب نہ تھی۔ کتاب ہوتی تو حضرت داودؑ اسے جانتے۔ حضرت زکریا پر وحی ہوئی " يَا زَكَرِيَّا إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ " اے ذکریا ہم تجھے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں۔ فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي " فرشتوں نے ان کو آواز دی جس وقت وہ نماز پڑھنے محراب میں کھڑے ہوئے تھے۔" إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ " کہ اللہ تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے۔ تو یہ وحی تھی کتاب نہ تھی۔ اگر کتاب میں یہ مضمون ہوتا تو نہ دعا مانگتے نہ تعجب کرتے۔ حضرت عیسیٰؑ پر وحی آئی۔ قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ " اللہ نے کہا میں تمہارے اوپر خوان اتاروں گا۔ یہ وحی تھی کتاب نہ تھی کیونکہ اگر یہ کتاب ہوتی تو نہ حواری مطالبہ کرتے نہ ضد و بحث ہوتی۔ یعنی کتاب میں یہ مضمون ہوتا کہ اللہ خوان اتار سکتا ہے اور اتارے گا تو اس صورت میں مطالبہ ہی نہ ہوتا کیونکہ انجیل توریت وغیرہ سب دفعۃً نازل ہو چکی تھیں۔ الغرض جو نبی صاحبِ کتاب نہیں تھے ان پر تو صرف وحی ہی وحی نازل ہوئی اور جو صاحبِ کتاب تھے ان پر کتاب سے پہلے اور کتاب کے بعد برابر وحی ہوتی رہی اور قرآن شریف میں بکثرت یہ وحیاں مذکور ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کا کسی

بشر سے کلام کرنا ہی وحی ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں۔ اور کتاب اس کی ایک قسم " أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا " میں مشتمل ہے۔ وحی عین کتاب نہیں ہے۔ وحی کبھی کتاب ہوگی کبھی " مِنْ وَرَاءِ حِجَابٍ " ہوگی۔ کبھی خالص وحی ہوگی۔

اب خاص طور سے اسے سمجھئے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی علاوہ قرآن شریف کے بھی آتی تھی۔

پہلی دلیل:۔ " وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ "۔ جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے چپکے سے ایک حدیث بیان کی پھر اس بیوی نے اس کو کسی دوسری سے کہہ دیا اور اللہ نے نبی پر اس واقعہ کو ظاہر کر دیا (یعنی اللہ نے نبی پر یہ ظاہر کر دیا کہ تیری بیوی نے اس بات کو دوسری بیوی پر ظاہر کر دیا ہے) تو نبیؐ نے اس بیوی سے کچھ حصہ بیان کیا اور کچھ نہیں بیان کیا۔ جب نبی نے بیوی کو اس واقعہ کی خبر دی تو بیوی نے کہا کہ آپ کو کس نے خبر کر دی۔ تو نبیؐ نے کہا کہ مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے۔ اللہ نے نبی پر یہ واقعہ ظاہر کیا۔" أَظْهَرَهُ اللَّهُ " اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ نے اس کا اظہار جو نبی پر کیا ہے یہ وحی تھی اور نبی نے جو یہ کہا کہ علیم و خبیر نے خبر دی۔ یہ وحی تھی۔ اس آیت کے دونوں ٹکڑے وحی غیر قرآن پر دلالت کر رہے ہیں۔ کیونکہ اللہ نے نبی پر جو اس واقعہ کو ظاہر کیا یہ قرآن میں کہیں مذکور نہیں ہے اور نبی نے جو یہ کہا کہ مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے تو علیم و خبیر کا یہ خبر دینا کہیں قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ قرآن کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی ہوئی۔

دوسری دلیل: " مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ " کھجور کے درخت جو تم نے کاٹ دیئے یا اُن کی جڑوں پر باقی رہنے دیئے

تو یہ (جو کچھ تم نے کیا ہے) اللہ کی اجازت سے کیا ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ وحی ہوئی۔ کیونکہ جس حکم کے ذریعہ ان درختوں کو کاٹا گیا وہ حکم قرآن شریف میں کہیں نہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ اذنِ الٰہی کس جگہ ہے۔ قرآن میں ہے یا قرآن سے باہر ہے اگر قرآن میں ہے تو دکھاؤ کہاں ہے۔ ہرگز قرآن میں ان درختوں کے کاٹنے کی اجازت نہیں ہے لیکن قرآن سے اجازت ثابت ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ اجازت دوسری وحی سے ہے جو علاوہ قرآن شریف کے ہوئی۔

تیسری دلیل: سورۂ بقرہ و آل عمران وغیرہ یہ سب سورتیں مدنی ہیں جو تقریباً دس سال بعد نازل ہوئی ہیں۔ تو جس طرح یہ نازل ہوئی تھیں اسی طرح ان کو کیوں ترتیب نہیں دیا گیا۔ جو سورۃ پہلے نازل ہوئی وہ پہلے لکھی جاتی۔ جو پیچھے نازل ہوئی وہ پیچھے لکھی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا۔ بلکہ پہلے نازل شدہ سورتیں پیچھے لکھی گئیں اور پیچھے والی پہلے لکھی گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ" (یعتذرون۔ یونس) جو لوگ ہماری ملاقات کے آرزومند نہ تھے وہ کہنے لگے کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لا۔ یا اس کو بدل دے۔ کہہ دے مجھ سے کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی طرف سے بدل دوں میں تو صرف وحی کا پابند ہوں۔

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ تبدیلی بغیر وحی کے نہیں ہو سکتی۔ یہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیلی تنزیلی ترتیب میں کی ہے یہ وحی سے کی ہے اور یہ وحی قرآن میں مذکور نہیں ہے یعنی کہیں قرآن میں یہ نہیں ہے کہ اے نبی یہ سورۃ یہاں لکھواؤ اور یہ وہاں۔ لہذا قرآن کے علاوہ وحی ہوئی۔

چوتھی دلیل: اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اِنْ هِیَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ" (قال فما۔ النجم) یہ صرف اسماء ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں اللہ کی منظوری کے بغیر۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ اللہ کی منظوری کے بغیر نام رکھنا ناجائز ہے۔ لہذا جو سورتوں کے نام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھے ہیں۔ سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران وغیرہ یہ قطعی اللہ کی منظوری سے رکھے ہیں۔ اور یہ منظوری قرآن میں کہیں نہیں دی بلکہ قرآن کے علاوہ منظوری دی گئی یہی وحی ہے جو قرآن کے علاوہ ہے۔

پانچویں دلیل: اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا" جب قرآن پڑھا جائے تو سنو۔ "اِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ" جب قرآن پڑھیں تو اس کی پیروی کرو۔ مگر قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اے نبی جب قرآن نازل ہوا کرے تو لکھ لیا کرو۔ یہ جو نبی صلعم نے قرآن کو لکھوایا یہ کس وحی سے آیا وحی قرآنی سے؟ تو وحی قرآنی تو ساکت ہے لہذا وحی غیر قرآنی سے اس کو لکھوایا۔

چھٹی دلیل: اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ" (لن تنالوا۔ النساء) دو دو تین تین چار چار جو عورتیں اچھی لگیں ان سے نکاح کر سکتے ہو۔ ہم پوچھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چار سے زیادہ نکاح کئے یہ کس وحی سے ہے؟ وحی قرآنی میں تو صرف چار تک کا حکم ہے۔ نبی صلعم کا یہ فعل بالضرور وحی غیر قرآنی سے ہوا۔

ساتویں دلیل: اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ" (تبارک۔ القیمۃ) جب ہم قرآن کی تلاوت کریں تو اس کی پیروی کرو (یعنی سنو) پھر (اس کے بعد) اس کا سمجھانا ہمارے ذمہ ہے یعنی قرآن کے نازل ہونے کے بعد قرآن کا بیان کرنا اور واضح کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔ اب ہم کہتے ہیں کہ یہ بیان

قرآن قرآن ہے یا قرآن سے علیحدہ ہے اگر قرآن ہے تو اس قرآن کے لئے پھر بیان کی ضرورت ہے۔ اگر قرآن کے علاوہ ہے تو بیانِ قرآن قرآن سے علیحدہ منزل من اللہ ہو گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے فرمایا کہ بیانِ قرآن ہمارے ذمہ ہے اور بیانِ قرآن غیر قرآن ہے کیونکہ اگر بیانِ قرآن قرآن ہوگا تو تسلسل لازم آئے گا۔ لہٰذا بیانِ قرآن غیر قرآن ہے اور وہ اللہ کے ذمہ ہے یعنی اللہ کی جانب سے ایسی وحی ثابت ہو گئی جو قرآن سے علیحدہ ہے۔

آٹھویں دلیل: بیت المقدس کو قریباً سترہ مہینے نبی صلعم نے قبلہ بنائے رکھا یہ کس وحی سے بنایا۔ وحی قرآن تو ساکت ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ اے نبی تم بیت المقدس کو قبلہ بناؤ۔ اور نبی صرف وحی کا پیرو ہے۔ لہٰذا بیت المقدس کو جس وحی سے قبلہ بنایا وہ وحی غیر قرآنی ہے۔

نویں دلیل: نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے کہ تین ہزار فرشتوں کی امداد تمہیں کافی نہیں ہے۔ اَلَنْ یَّکْفِیَکُمْ اَنْ یُّمِدَّکُمْ رَبُّکُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَةِ ۔ یعنی اللہ نے ان کے قول کو نقل کیا ہے۔ نبی کے اس قول سے قبل یہ قول کہیں قرآن میں نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ نبی کو اس قول کی وحی قرآن سے الگ ہوئی تھی۔

دسویں دلیل: یُّوْصِیْ بِهَآ اَوْ دَیْنٍ " اس آیت میں وصیت مقدم ہے دین پر لیکن نبی نے دین کو وصیت پر مقدم کر دیا۔ اور نبی وحی کے خلاف نہیں کر سکتا۔ اور وحی قرآنی میں اس تبدیلی کا حکم موجود نہیں ہے لہٰذا قرآن کے علاوہ وحی ہوئی تھی۔

گیارہویں دلیل: وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰکُمْ " اللہ نے تم کو جس طرح ہدایت کی ہے اس طرح تکبیر کہو۔ اللہ نے قرآن میں کہیں تکبیر کا طریقہ نہیں بیان کیا۔ صرف نبی نے بیان کیا ہے۔ اللہ نے نبی کے بتائے ہوئے طریقے کو اپنی طرف منسوب کیا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ نبی کو وحی کی کہ اس طرح تکبیر کہو یا تکبیر پڑھو۔ اور یہ وحی کہ اس طرح تکبیر کہو

قرآن شریف میں شامل نہیں ہے۔

بارہویں دلیل: اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاِذْ قُلْنَا لَکَ اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ " (یاد کرو اس وقت کو) جب ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ بیشک تیرے رب نے لوگوں کو گھیر لیا ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ قرآن شریف کے علاوہ دوسری وحی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔ کیونکہ قرآن شریف میں اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ کہیں نہیں ہے اور یہاں اللہ نے فرمایا کہ ہم نے تجھ سے کہا تھا کہ بے شک لوگوں کو تیرے رب نے گھیر لیا ہے، تو معلوم ہوا کہ اللہ نے نبی سے قرآن کے علاوہ دوسری وحی کے ذریعہ کہا تھا کہ:- اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ یعنی تیرے رب نے لوگوں کو گھیر لیا ہے اور اب اس کہنے کو یاد دلایا ہے۔

تیرھویں دلیل: فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی " اللہ نے اپنے بندہ کو جو وحی کرنی تھی کی۔ یہ صاف دلیل ہے کہ جو کچھ وحی ہوئی وہ وحی قطعاً قرآن نہیں ہے۔ اس لئے کہ وحی قرآنی سب کو معلوم ہے اور اس وحی کا کسی کو صحیح پتہ نہیں۔ نیز قرآن یا مکی ہے یا مدنی۔ اور یہ وحی نہ مکی ہے نہ مدنی۔ غرض بے شمار دلیلیں موجود ہیں قرآن کے علاوہ دوسری وحی پر" مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی " وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا اس کا نطق صرف وحی ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف قرآن اپنی خواہش سے نہیں بولتا تو یہ غلط ہے۔ اس لئے کہ قرآن کو آیت میں محذوف نکالنا پڑے گا۔ اور حذف خلافِ اصل ہے۔ دوسرے ھُوَ کی ضمیر کا مرجع اوپر مذکور نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ سیدھے رستے سے رکا اور نہ ٹیڑھا چلا۔ عمل کی صفائی " مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی " سے کر دی۔ اور قول کی صفائی " مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی " سے کر دی۔ یعنی اس کا قول و فعل من جانب اللہ ہے۔ اس کے علاوہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ مطلقاً نطق ہوائی کی نفی ہے۔ اور اگر قرآن کے نطق

ہوائی کی نفی ہوگی اور اس کے علاوہ الگ نطق ہوائی ہوگا تو نطقِ ہوائی سے نطق غیر ہوائی قطعاً ثابت نہیں ہوگا۔ کیونکہ جس وقت وہ یہ کہے گا کہ یہ اللہ کا قول ہے۔ یعنی یہ کہے گا کہ: الم ذالک الکتاب اللہ کا قول ہے تو نبی کا یہ قول اگر ہوا سے ہوگا تو اللہ کا قول اس ہوائی قول سے ہرگز ثابت نہیں ہوگا۔ لہذا اس کا ہر قول غیر ہوائی ہے۔ اور وحی ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ نبی کا ہر قول و فعل جو قرآن میں مذکور نہیں ہے اس کی بابت کیا کہتے ہو۔؟ اگر وحی سے ہے تو قرآن کے علاوہ وحی ثابت ہوگئی اور اگر وحی سے نہیں ہے تو اس آیت کے خلاف ہوا جاتا ہے کہ "اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ" میں تو صرف وحی کا پیرو ہوں۔ اگر کوئی کہے کہ نبی کا ہر قول و فعل وحی سے ہے اور وحیِ قرآنی سے ہے بعض اقوال و افعال نص سے ہیں۔ بعض استنباط سے ہیں تو یہ غلط ہے۔ اللہ تعالے نے فرمایا۔ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰہُ "، اللہ جو معنی دکھاتا تھا اس پر حکم صادر فرماتے تھے استنباط نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ استنباط کے لئے اشتراکِ علت ضروری ہے۔ جہاں علت مشترک نہیں ہے وہاں استنباط نہیں ہوسکتا۔ اب دیکھئے:۔

شدید القویٰ: "عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی" میں

روح الامین: "نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ"۔ "فَاَرْسَلْنَآ اِلَیْھَا رُوْحَنَا" میں

رسول الکریم: "اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ" میں

ان سب سے مراد جبریل ؑ ہیں۔

دنیا کی تمام طاقتیں مل کر بھی استنباط نہیں کرسکتیں کہ ان الفاظ کے معنی جبریل ہیں۔ جب تک متکلم خبر نہ دے کہ ان الفاظ سے جبریل مراد ہے۔

قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ ان الفاظ سے جبریل سمجھ لینا۔

اسی طرح "ذُوالنُّوْن" اور "صاحبِ حُوت" سے مراد یونس ؑ ہیں۔ کہیں سے بھی مستنبط نہیں ہوسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے اقوال موجود ہیں اور ایسے افعال موجود ہیں جو قطعاً نہ قرآن میں موجود ہیں نہ قرآن سے ثابت ہیں۔ نہ اشارۃً، نہ اقتضاءً، نہ دلالۃً۔

بتاؤ یہ اقوال و افعال بالوحی ہیں یا نہیں؟

اگر بالوحی ہیں تو یہ وہی وحی ہے جس کے ہم درپے ہیں۔ اگر بالوحی نہیں ہیں تو قطعی "اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ" کے خلاف ہیں۔ اور ایسا کہنا کفر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے پیرو نہ تھے۔ مَعَاذَ اللہ۔

بہرحال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و فعل بالوحی تھا۔

حدیثِ رسولؐ فی نفسہٖ دین میں حجّت ہے یا نہیں؟

سوال : حدیث نبی اور نبی کا قول حجّت ہے یا نہیں ۔؟

جواب : نبی کا قول حجّت ہے ۔

ثبوت : یہاں تین صورتیں ہیں (۱) ایک تو یہ کہ نبی کا ہر قول حجّت ہے (۲) دوسری صورت یہ ہے کہ نبی کا کوئی قول حجّت نہیں ہے (۳) تیسری صورت یہ ہے کہ نبی کا بعض قول حجّت ہے اور بعض حجت نہیں ہے۔ بس صرف تین صورتیں اور شقیں ہیں اور کوئی شق نہیں ہے۔ تیسری شِق یعنی نبی کا بعض قول حجت ہے اور بعض قول حجت نہیں ہے یہ شق باطل ہے۔ اسی لئے کہ بعض قول کا حجت ہونا اور بعض قول کا حجت نہ ہونا یہ ترجیح بلا مرجح اور تخصیص بغیر مخصص ہے۔

ترجیح بلا مرجح اور تخصیص بلا مخصص کے یہ معنی ہیں کہ بعض قول حجّت ہے بغیر وجہ کے اور بعض قول حجت نہیں ہے بغیر وجہ کے۔ یعنی جبکہ نبی کے دونوں قول ہیں وہ بعض بھی جو حجّت ہیں اور وہ بعض بھی جو حجت نہیں ہیں تو بغیر وجہ کے ایک بعض حجت ہو دوسرا بعض حجت نہ ہو۔ اس کو ترجیح بلا مرجح اور تخصیص بلا مخصص کہتے ہیں۔ اور ترجیح بلا مرجح اور تخصیص بغیر مخصص بداہتہً باطل ہے لہذا بعض قول کا حجت ہونا اور بعض قول کا حجت نہ ہونا یہ شق بالکل باطل ہوگئی۔ اس لئے کہ یہ بعض بھی نبی کا قول ہے جو حجّت ہے اور وہ بعض بھی نبی کا قول ہے جو حجت نہیں ہے اور قول ہونے میں دونوں برابر ہیں تو یہ بات غیر معقول ہے کہ ایک بعض تو حجت ہو اور دوسرا بعض حجت نہ ہو کیونکہ جب

دونوں نبی کے قول ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایک تو حجت ہو اور دوسرا حجت نہ ہو۔ اس دلیل کا حاصل یہ ہے کہ جو بعض قول حجت ہے اس بعض قول کے حجت ہونے پر کونسی شے حجت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نبی کے بعض قول کے حجت ہونے پر اللہ کا قول حجت ہے۔ یعنی نبی کا قول اگر اللہ کے قول کے مطابق ہے تو بے شک نبی کا قول حجت ہے اور اگر اللہ کے قول کے مطابق نہیں ہے تو نبی کا قول اس وقت حجت نہیں ہے۔ اس مقولہ کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر نبی کا قول اللہ کے قول یعنی قرآن کے مطابق ہے تو نبی کا قول حجت ہوگا ورنہ نہیں یعنی ترجیح بلا مرجح اور تخصیص بلا مخصص لازم نہیں آتی کیونکہ مرجح اور مخصص اللہ کے قول کی مطابقت ہے ہم کہتے ہیں کہ اللہ کا قول اور قرآن کی آیت نبی کے قول پر اس وقت حجت ہوگی کہ جب اللہ کا قول اور قرآن کی آیت معلوم ہو جائے اور معین ہو جائے کہ یہ اللہ کی طرف سے آیت نازل ہوئی ہے۔ یہ اللہ ہی کا قول ہے۔ یہ قرآن ہی کی آیت ہے اور قول اللہ اور آیت اللہ کا معلوم ہونا اور معین ہونا ناممکن ہے جب تک کہ نبی معلوم نہ کرائے اور معین نہ کرے اور جب نبی معلوم کرائے گا بتائے گا اور معین کرے گا تو نبی کا وہ قول جس سے اس آیت کو نبی معلوم کرائے گا اس آیت اور اس قولِ الٰہی کی معلومیت اور تعین پر حجت ہوگا۔ تب کہیں جاکے یہ آیت اور قول الٰہی حجت ہوگا اور یہ معاملہ بالکل الٹا ہوگیا۔ یعنی کہا یہ گیا تھا کہ اللہ کا قول نبی کے قول پر حجت ہے اور ثابت یہ ہوگیا کہ نبی کا قول اللہ کے قول پر حجت ہے اور یہی حق ہے۔ لہذا تیسری شق کہ نبی کا بعض قول حجت ہے اور بعض حجت نہیں، باطل ہوگئی۔ اب رہی دوسری شق کہ نبی کا کوئی قول حجت نہیں یہ کہنا کفر وجنون اور پوری قوم کے اجماع کے خلاف ہے۔ نیز ہم کہتے ہیں اگر نبی کا کوئی بھی قول حجت نہیں ہوگا تو خدا کا قول بھی حجت نہیں ہوگا۔ کیونکہ نبی جب یہ کہے گا کہ آج مجھ پر قُل ھُوَ اللہ کی سورة نازل ہوئی اور جب نبی کا کوئی بھی قول حجت نہیں ہے تو یہ قول بھی حجت نہیں رہا۔ اور جب یہ قول یعنی کہ آج

مجھ پر قُلْ هُوَ اللّٰهُ کی سورۃ نازل ہوئی ہے حجت نہیں رہا، تو چونکہ یہ قول نبی قُلْ هُوَ اللّٰهُ کو شامل ہے اس لئے قولِ الٰہی قُلْ هُوَ اللّٰهُ بھی حجت نہیں رہا۔ حالانکہ بالاتفاق خدا کا قول حجت ہے تو لابد نبی کا قول بھی حجّت ہوگیا۔ اور یہ شق کہ نبی کا کوئی قول حجت نہیں ہے بالکل باطل ہوگئی اور جب پچھلی دونوں شقیں باطل ہوگئیں تو بالضرور پہلی شق یعنی نبی کا ہر قول حجت ہے۔ ثابت ہوگئی۔ غور کرنا چاہیئے۔

اب قرآن شریف سے ہم ثابت کرتے ہیں کہ قول رسول حجت ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا: "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ" (والمحصنٰت۔ النساء) اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، اور تم میں سے جو اولی الامر ہیں ان کی اطاعت کرو پھر اگر کسی شے میں تم کو اختلاف ہو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو، اگر تم اللہ اور روزِ جزاء پر ایمان رکھتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو، کسی ذی شعور اور با اختیار کی اطاعت اس ذی شعور اور با اختیار کے حکم اور قول کی اطاعت ہوا کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے یہ معنی ہیں کہ اس کے قول کی اطاعت ہو اور یہ اطاعت صرف قرآن کی اطاعت ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ اَطِیْعُوا اللّٰهَ کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کی اطاعت کرو۔ اسی طرح اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کے بھی یہی معنی ہیں کہ رسول کے قول کی اطاعت کرو۔ اب اگر کہو کہ رسولؐ کا قول اور قرآن دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ تو یہ بالکل غلط ہے اور اگر رسول کا قول اور چیز ہے اور قرآن اور چیز ہے یعنی دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں تو اس صورت میں اس آیت کے حکم کے مطابق قول رسول علاوہ قرآن کے حجت ہوگیا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ رسول کی اطاعت کے یہ معنی ہیں کہ قرآن کی رُو سے قرآن کی روشنی میں رسول جو اقوال اور احکام بیان

کرے وہ مانو اور اسی طرح اولی الامر قرآن کی روشنی میں جو احکام صادر کریں وہ مانو تو ہم کہتے ہیں کہ رسول کے وہ اقوال و احکام اور اولی الامر کے وہ احکام جو ہرگز قرآن کی روشنی میں نظر نہیں آتے وہ قطعًا اس وقت ناقابلِ اطاعت ہوں گے۔ اور ان کی اطاعت واجب نہیں ہوگی۔ اس کی توضیح ایک مثال سے ہوسکتی ہے۔ رسولؐ نے فرمایا کہ صبح کی نماز میں فرض دو رکعتیں ہیں اور مغرب کی نماز میں تین رکعتیں ہیں باقی تینوں نمازوں میں چار چار رکعتیں ہیں اور نبی کا یہ قول تواتر سے ثابت ہے اور نبی کا یہ قول نہ قرآن میں نظر آتا ہے نہ قرآن کی روشنی میں نظر آتا ہے تو اب بولو کیا کہتے ہو؟ نبی کا یہ قول واجب اطاعت ہے یا نہیں۔ اگر کہو ہاں واجبِ اطاعت ہے تو بے شک نبی کے قول کے حجت ہونے کے یہی معنی ہیں اور اگر کہو کہ نبی کا یہ قول واجب اطاعت نہیں ہے تو یہ کفر و جنون کا مجموعہ ہے۔ یعنی جو شخص صبح کے دو فرض اور مغرب کے تین فرض اور باقی نمازوں کے چار چار فرض نہ مانے وہ کافر ہے اور مجنون ہے۔

—— مطلب یہ ہے کہ قرآن بغیر شرط کے حجت ہے۔ اس میں کوئی قید نہیں ہے کہ عقل کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ بالکل اسی طرح نبی کا قول حجّت ہے۔ خواہ وہ نبی کا قول قرآن سے ماخوذ ہو، خواہ ماخوذ نہ ہو۔ مستقل طور پر نبی کا قول ہو تب بھی حجت ہے۔ یعنی جس طرح اَطِیْعُوا اللّٰهَ قرآن کے حجّت ہونے پر دلالت کر رہا ہے اسی طرح اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ نبی کے قول کے حجت ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ اسی طرح اولو الامر کا لفظ اجماع کے حجت ہونے پر دلالت کر رہا ہے اور یہ تینوں بلا شرط مستقل حجتیں ہیں۔ برخلاف حاکم و امام اور باپ وغیرہ کی اطاعتوں کے کیونکہ یہ اطاعتیں مشروط ہیں۔ اگر قرآن اور حدیث یا دین کے مطابق ہوں تو اطاعت کی جائے گی ورنہ نہیں کی جائے گی۔ حاصل یہ ہے کہ اس وقت جو متفق علیہ دین ہے

وہ کل کا کل صرف قرآن سے ثابت نہیں ہے بلکہ کچھ حدیث یعنی قولِ رسولؐ سے ثابت
ہے اور کچھ اجماع سے ثابت ہے۔ مثلاً منکر فرضیتِ صومِ رمضان کافر ہے۔ یہ مسئلہ
دین کا ہے۔ اگرچہ قرآن اور حدیث میں اس کی تصریح نہیں ہے لیکن یہ اجماع سے
ثابت ہے۔ لہٰذا یہ تینوں غیر مشروط حجتیں ہیں۔ اب رہا قیاس تو وہ مشروط حجت ہے
اس میں شرط ہے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ پس اگر ان تینوں حجتوں کے بعد کسی شرعی
مسئلہ میں اختلاف ہو تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کر لو۔ یعنی اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش
آئے جو قرآن سے حدیث سے اجماع سے ثابت نہ ہو تو قرآن اور حدیث میں سے
ملتا جلتا مسئلہ دریافت کرو جو حکم قرآن و حدیث میں اس مسئلہ کا ہے۔ وہی حکم اس
مسئلہ مختلف فیہ کو دے دو۔ اس کو قیاس کہتے ہیں۔ اس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اختلاف
کے وقت قرآن کی طرف رجوع کرو۔ کیونکہ قرآن کی طرف اور حدیث کی طرف
تو اول وہلہ میں رجوع ہوگا اور جب وہاں سے مسئلہ کا حکم نہ معلوم ہوگا تو پھر اختلاف
ہوگا۔ اور اختلاف کے بعد اس مسئلہ مختلف فیہ کی نظیر قرآن و حدیث میں تلاش ہوگی
اور جو حکم اس کا ہوگا وہی اس کو دے دیا جائے گا۔ جیسا کہ تمام مجتہدین کرتے ہیں۔
لہٰذا اس آیت میں چاروں حجتوں کا بیان کر دیا۔ تین غیر مشروط ہیں ایک مشروط ہے۔
لہٰذا نبیؐ کا قول حجت ہے اور یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ قرآن تو نبی کا قول ہے
ہی نہیں قرآن تو خدا کا قول ہے جس کو نبیؐ نے نقل کیا ہے۔ لفظاً لفظاً۔ قرآن کے
علاوہ جتنی باتیں نبی کرتا ہے، خواہ وہ باتیں قرآن سے ماخوذ ہوں خواہ نہ ہوں وہ
سب باتیں نبی کا قول کہی جاتی ہیں اور ہم نے نبی کے اس قول کو حجت کہا ہے جو نہ قرآن
ہے نہ قرآن سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ اگر ہم ایسا مضمون بیان کریں جو قرآن سے ماخوذ
ہے تو اس صورت میں ہمارا قول بھی حجت ہوگا۔ قرآن کی ماخوذیت کے اعتبار سے،
نہ یہ کہ ہمارا قول مستقل حجت ہے لیکن نبی کا قول مستقل حجت ہے۔ اس کی مثال

ایسی ہے جیسی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو تبلیغ کی تھی تو اس وقت
توراۃ نازل نہیں ہوئی تھی تو اگر موسیٰ علیہ السلام کا قول حجت نہ ہوتا تو فرعون
مستوجب عتاب نہ ہوتا۔ غرضیکہ نبی کا قول نزولِ کتاب سے قبل اور نیز نزولِ کتاب
کے وقت اور نزولِ کتاب کے بعد ہر وقت حجت ہے۔ اور اگر نبی کا قول قطع نظر
کتاب سے حجت نہ ہوگا تو کثیر انبیاء کی نبوت باطل ہو جائے گی کیونکہ کثیر انبیاء پر
کتابیں نازل نہیں ہوئیں، تو اگر صرف کتاب ہی حجت ہوتی تو بے کتاب کا نبی صاحب
حجت نہ ہوتا۔ اور اس کا انکار کفر اور موجب عتاب نہ ہوتا لہٰذا نبی کا قول حجت ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے دو قول ہیں، ایک قول کے ساتھ معجزہ متعلق ہے
دوسرے قول کے ساتھ معجزہ متعلق نہیں ہے۔ جس قول کے ساتھ معجزہ متعلق ہے اس
کو قرآن کہتے ہیں۔ جس قول کے ساتھ معجزہ متعلق نہیں ہے وہ قول قولِ رسول کہلاتا
ہے۔ تو جس طرح قول با معجزہ حجت ہے اسی طرح قول بے معجزہ حجت ہے جس طرح تمام
سابقین انبیاء کے اقوال اور کتب سب معجزہ سے خالی تھے اور باوجود معجزہ سے
خالی ہونے کے وہ سب کے سب حجت تھے اسی طرح خاتم النبیین کے جملہ اقوال حجت
ہیں۔ اللہ تعالےٰ اگر کسی انسان کو بذریعہ وحی خطاب کرے تو یہ خطاب ہی نبوت ہے
اور یہ نبی عوام کو خطاب کرے تو یہ خطابِ رسالت ہے۔ اگر نبی کا خطاب عوام کے لئے
حجت نہ ہوگا تو رسالت حجت نہ رہے گی۔ تو اب کون سی چیز عوام پر حجت ہوگی کیونکہ
عوام کو تو خدا کا خطاب براہ راست پہنچ نہیں سکتا۔ نبی کے ہی واسطے سے پہنچے گا اس
لئے بالضرور نبی کا خطاب جو خدا کے خطاب کو متضمن ہے، حجت ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ
معجزہ نبی کی صداقت پر دلالت کر رہا ہے۔ یعنی معجزہ اس بات پر حجت ہے کہ مدعی نبوت
صادق ہے۔ اور جو کچھ نبی کہے گا وہ سب صادق ہوگا۔ خواہ یہ کہے کہ یہ قرآن ہے یہ مجھ
پر نازل ہوا، خواہ اس کے علاوہ کوئی اور بات کہے۔ تو جس طرح اس کے کہنے سے قرآن

مانا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کے کہنے سے قرآن کے علاوہ دوسری بات مانی جاتی ہے اور وہ دوسری بات نبی کا قول اور نبی کی حدیث کہلاتی ہے۔ معجزہ نے نبی کی مطلقاً صداقت ثابت کی ہے۔ معجزہ نے صرف یہ نہیں ثابت کیا کہ اگر نبی کوئی بات من جانب اللہ کہے تو وہ صادق ہے۔ بلکہ معجزہ نے مطلق صداقت نبی کی ثابت کی ہے۔ اب جب یہ ثابت ہوگیا کہ نبی صادق ہے تو اس صادق نے دو باتیں کہی ہیں۔ ایک کا نام قرآن ہے دوسری کا نام حدیث ہے تو جس طرح اس کی صداقت قرآن پر حجت ہے اسی طرح اسکی صداقت حدیث پر حجت ہے۔ یعنی قرآن کو نبی کے کہنے سے مانا گیا ہے تو گویا نبی کا کہنا اور نبی کا قول قرآن کے قرآن ہونے اور قرآن کے حجت ہونے پر حجت ہے۔ تو قرآن کی حجیت کی علت نبی کا قول ہوا۔ اسی طرح نبی کا قول حدیث کے حجت ہونے پر اور حدیث کے قابل قبول ہونے پر حجت ہوا۔ بولو کیا کہتے ہو؟ قرآن کو قرآن کس کے کہنے سے، کس کے قول سے مانا۔ نبیؐ کے قول سے مانا۔ نبی کے کہنے سے مانا۔ تو بے شک نبی کا قول حجت قرآن پر ہوگیا۔ بالکل اسی طرح نبی کا قول تمام اقوالِ نبی پر حجت ہوگیا۔ یعنی معجزہ نے یہ بتادیا کہ نبی سچا ہے۔ اس کی بات مانو۔ قرآن شریف سے دوسرا ثبوت "رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ" یعنی رسول خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے اس لئے بھیجے ہیں کہ رسولوں کے آنے کے بعد اللہ پر لوگوں کے لئے حجت باقی نہ رہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ رسول لوگوں پر حجت ہیں اور فرمایا "مَا کُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا" (سبحان الذی ۔ بنی اسرائیل) جب تک رسولوں کو نہیں بھیجتے اس وقت تک ان کو عذاب نہیں کرتے۔ یعنی رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں پر حجت قائم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ لوگ رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور اس انکار کے سبب وہ مستحق عذاب ہو جاتے ہیں۔ اور فرمایا "اِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" (الیہ یرد ۔ شوریٰ) بیشک تو سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ اگر رسولؐ کا قول حجت نہ ہوتا تو اس کی

ہدایت سیدھے راستے کی طرف نہ ہوتی اور فرمایا "اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" (ومن یقنت ۔ یٰس) قطعی تو رسول ہے اور سیدھے راستے پر ہے۔ تو جو شخص سیدھے راستے پر خود ہو اور سیدھے راستے کی ہدایت بھی کرے اس کا قول حجت نہ ہو یہ عجیب بات ہے۔

اور فرمایا "لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ" (اتل ما اوحی ۔ الاحزاب) تمہارے لئے رسول اللہ کا بہترین نمونہ کافی ہے۔ اور فرمایا "فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ" (والمحصنٰت ۔ نسآء) قسم ہے تیرے پروردگار کی یہ مومن ہو ہی نہیں سکتے جب تک کہ یہ اپنے تمام معاملات متنازعہ فیہ میں تجھ کو حکم نہ بنالیں اور یہ نہیں فرمایا کہ مجھ کو حکم نہ بنالیں بلکہ تجھ کو حکم نہ بنالیں۔ اگر رسول کا قول حجت نہ ہو تو پھر وہ کیونکر حکم بن سکتا ہے۔ قرآن کی رو سے نبی حکم ہے اور حکم کا قول حجت ہے یہ بات معلوم ہونی چاہیئے کہ حجت کے معنی موجب ایمان اور موجب عمل کے ہیں۔ سو بعض حجت تو موجب ایمان و عمل ہے اور بعض حجت صرف موجب عمل ہے اور بعض حجت صرف موجب ایمان ہے۔ قرآن شریف کا وہ حصہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ "اُمُّ الْکِتَابِ" اور آیاتِ محکمات ہیں وہ موجب ایمان بھی ہے اور موجب عمل بھی۔ اور وہ حصہ جس کے متعلق فرمایا ہے کہ متشابہات ہیں۔ وہ صرف موجب ایمان ہے، موجب عمل نہیں۔ اور اس کی پیروی کو زیغ اور کجی سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن نبی کا قول کل کا کل موجب ایمان اور موجب عمل ہے۔ نبی کے قول میں تقسیم نہیں ہے جس طرح خدا کے قول میں تقسیم ہے۔ لیکن نبی کا وہ قول جو بطریق ظن آیا ہے وہ صرف موجب عمل ہے۔ موجب ایمان نہیں ہے اور عنقریب اس کا بیان آتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ قرآن بہرحال حجت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کے حجت ہونے کی کیا علت ہے۔ اگر منجانب اللہ ہونا حجت ہونے کی علت ہے تو ہر وہ شے جو منجانب

اللہ ہے وہ حجت ہو جائے گی۔ اللہ تعالے فرمایا۔" قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی ہر حسنہ وسیئہ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ اس صورت میں سیئہ حجت ہو جائے گی نیز متشابہات بھی منجانب اللہ ہیں لہذا وہ بھی حجت ہو جائیں گے۔ حالانکہ سیئہ اور متشابہات دونوں حجت عمل نہیں ہیں۔ بلکہ علت حجت راحکام ہے جس کے متعلق فرمایا:۔

" آیَاتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ (تلک الرسل۔ آل عمران) اس میں محکم آیتیں ہیں جو اصل کتاب ہیں۔ لہذا اب محکم اور متشابہ میں تمیز کون کرے۔ جو تمیز کرے گا اسی کا قول حجت ہوگا۔ اور یہ تمیز صرف نبی کے قول سے ہوتی ہے۔ لہذا نبی کا قول حجت ہے اور فرمایا اللہ تعالے نے " وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ " اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس شے کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور رسول کی طرف۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر رسول کا قول حجت نہ ہوتا تو رسول کی طرف بلانا بے سود ہوتا۔ اور فرمایا۔" وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ " یعنی کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر صرف اس لئے کہ باذن الٰہی اس کی اطاعت کی جائے۔

" مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ " یعنی جس نے رسول اللہ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ غرضیکہ بے شمار آیات ہیں۔ جن سے رسول کا مطاع ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔ کتاب کے علاوہ کوئی اور چیز بھی حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے " اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ " (حٰمٓ۔ الاحقاف) اس سے پہلے کی کسی کتاب سے یا آثار علمی سے ان بتوں کی شرکت میرے ساتھ ثابت کرو اگر تم سچے ہو یعنی اللہ تعالیٰ ان مشرکین سے حجت مانگتا ہے کہ تم جو بتوں کو میرا شریک ٹھہرا رہے ہو اس پر کیا حجت ہے۔ یا کتاب یا آثار علمی۔ بہر

صورت ان دونوں میں سے کوئی چیز لاؤ۔ اس سے پتہ چل گیا کہ اللہ کے نزدیک آثار علمی حجت ہیں جس کا مطالبہ اللہ نے کیا۔ اور یہ آثار علمی کتاب سے علیحدہ چیز ہیں۔ جو حجت ہونے میں اللہ کے نزدیک معتبر ہے۔ کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جو انبیاء سابقین پر نازل ہوئیں اور آثار علمی سے مراد وہ احادیث اور آثار ہیں جو انبیاء سابقین سے بطور خبر واحد منقول ہیں۔ اور بالکل یہ آثار علمی وہی چیز ہے جسے ہم آثار اور احادیث کہتے ہیں۔ اور فرمایا۔" وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ۔ (اقترب۔ الحج) کچھ ایسے لوگ ہیں جو اللہ کی ذات وصفات میں بغیر علم وہدایت اور بغیر روشن کتاب کے مباحثہ کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ علم وہدایت روشن کتاب کے علاوہ حجت ہیں۔ علم تو بدیہی مقدمات کو کہتے ہیں ہدایت ان نظری مقدمات کو کہتے ہیں جو بدیہی مقدمات سے ثابت ہوتے ہیں غرضیکہ قرآن شریف میں بیشمار آیات موجود ہیں جن سے نبی کے قول کا حجت ہونا ثابت ہے اور اصل دلیل وہی ہے کہ معجزہ نبی کی صداقت پر حجت ہے اور نبی کی صداقت قرآن و حدیث دونوں پر حجت ہے۔ اور معجزہ حسی طور پر معلوم ہوا کرتا ہے۔ اس لئے معجزہ کے لئے حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ کلام اللہ اور کلام اللہ سے جو احکام اور معنی ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو اقوال نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوتے ہیں وہ قطعاً حجت ہیں اور دلیل وہی ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔

منکرین حدیث نے کہا ہے کہ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی) میں جس اطاعت کا بیان ہے اس اطاعت سے رسول کی ذات مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالے نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ کسی نبی کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ اس لئے خود رسول اللہ سے کہہ دیا گیا کہ آپ کو لوگوں کے متنازعہ فیہ امور کے فیصلے

کتاب اللہ کے مطابق کرتے ہیں۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ ۔ تم ان کے درمیان
کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔ اور منکرین حدیث نے کہا ہے کہ آیت مَا كَانَ لِبَشَرٍ
أَنْ يُّؤْتِيَهُ اللهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا
عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ کے یہ معنی ہیں کہ کسی انسان کو یہ حق
نہیں پہنچتا کہ اللہ اُسے کتاب اور حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ
تم اللہ کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم ربانی بن جاؤ۔ میں کہتا
ہوں کہ یہ معنی غلط ہیں۔ کیونکہ آیت میں لفظ ہے كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ کا یعنی نبی کو یہ حق
نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ
کے معنی کسی لغت میں یہ نہیں ہیں کہ میری محکومی اختیار کرو۔ عِبَاد کے معنی بندے اور
مخلوق کے ہیں، نہ محکوم کے اور نہ مطیع کے۔ اور عباد کا لفظ مومن، کافر، جاندار، بے
جان سب کو شامل ہے۔" اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ
(قال الملا۔ الاعراف) بے شک اللہ کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے
بندے ہیں۔ اور فرمایا "يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ" (فمن اظلم۔ الزمر)
اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے" فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا "
(سبحان الذی۔ الکھف) ان دونوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پالیا۔
غرضیکہ عبد اور عباد کا لفظ جہاں بھی قرآن میں آیا ہے مخلوق کے معنی میں ہے اور بندے کے
معنی میں ہے۔ نہ محکوم کے معنی میں۔ آیت " ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ " کے
معنی یہ ہیں کہ پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، یعنی یہ نہیں
کہہ سکتا کہ میں خالق ہوں تم میری مخلوق ہو جاؤ، میں معبود ہوں تم میرے عباد ہو جاؤ۔
یہ ترجمہ نہیں ہے کہ پھر وہ کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ یا میری محکومی اختیار کرو۔
مطلب یہ ہے کہ بد کو بھی بندہ کہا، نیک کو بھی بندہ کہا۔ بندے ہونے میں تمام مخلوق

برابر ہے اور محکوم ہونا اور مطیع ہونا ذوی العقول کے ساتھ خاص ہے یعنی مَا
اَنْزَلَ اللهُ کے ساتھ حکم کرنا ذی عقل ہی کے ساتھ خاص ہے اور عبد ذی عقل اور
بے عقل دونوں میں مشترک ہے، اب اگر كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ کے معنی كُوْنُوْا مَحْكُوْمِيْنَ لِيْ
ہوں گے تو تمام جمادات اور نباتات سب کے سب مَا اَنْزَلَ اللهُ کے مخاطب ہوں
گے حالانکہ ان کو مَا اَنْزَلَ اللهُ کے ساتھ خطاب نہیں کیا گیا۔ ان کو وہ احکام نہیں
بتائے گئے جو انسانوں کو بتائے گئے ہیں اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ عباد کے معنی
بندے اور مخلوق کے ہیں۔ نہ کہ محکومین کے اور مطیعین کے۔

اب ہم یہ پوچھتے ہیں کہ تم بتاؤ تو سہی کہ یہ آیت جس شخص نے سنائی، تم نے
اس آیت کو مانا یا نہیں مانا۔ اگر نہیں مانا تو کافر ہو گئے۔ اور اگر مانا تو بغیر مَا اَنْزَلَ
اللہ اور بغیر کتاب اللہ کے حکم کے مانا تو قطعاً محمد صلی اللہ علیہ وسلم مستقل مطاع
ہو گئے۔ کتاب اللہ میں کہاں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے سے آیت کو مانو
اگر کوئی ایسی آیت پیش کرو گے کہ جس میں یہ مضمون ہو گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کے کہنے سے اس آیت کو مانو تو اس آیت کو کس آیت کے کہنے سے مانا؟ مطلب
یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے معنی کتاب اللہ کی اطاعت
کے ہیں۔ کیونکہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور اللہ کی اطاعت کتاب
اللہ کی اطاعت ہے۔ تو رسول کی اطاعت درحقیقت کتاب اللہ کی اطاعت
ہے۔ لیکن یہ اطاعت رسول کی ذات کی اطاعت نہیں ہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ جب
رسول کی اطاعت کتاب اللہ کی اطاعت ٹھہری تو بتاؤ کہ کتاب اللہ کی اطاعت کس
کی اطاعت ہے؟ اللہ کی اطاعت ہے یا رسول اللہ کی اطاعت ہے؟ اگر کہو کہ
کتاب اللہ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے تو تم ابھی کہہ چکے ہو کہ رسول کی اطاعت
کتاب اللہ کی اطاعت ہے تو یہ بالکل الٹ پلٹ ہو گیا۔ اور نیز تم کہتے ہو کہ تا

کی اطاعت بذریعہ رسول ہے تو رسول کی اطاعت کتاب کی اطاعت سے مقدم ہو گئی۔ اور جب رسول کی اطاعت کتاب سے مقدم ہو گئی تو یہ رسول کی ذات کی اطاعت ہوئی نہ کہ کتاب کی۔ حاصل یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ رسول کی ذات کی اطاعت نہیں ہے بلکہ اللہ کی یعنی کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ کتاب اللہ کو کتاب اللہ ماننے ہیں کس کی اطاعت ہے۔ کتاب اللہ کی اطاعت ہے یا رسول اللہ کی؟ اگر کہو کہ اللہ کی اطاعت ہے یعنی اللہ کے کہنے سے کتاب اللہ کو کتاب اللہ مانا ہے تو یہ بالکل جنون ہے۔ اگر کہو کہ کتاب اللہ کو کتاب اللہ سے مانا ہے تو یہ حماقت ہے۔ اگر کہو کہ کتاب اللہ کو رسول اللہ کے کہنے سے مانا ہے تو یہ حق ہے۔ اور اب رسول اللہ کی اطاعت کتاب اللہ سے مقدم ہو گئی۔ اور یہی رسول اللہ کی ذات کی اطاعت کے معنی ہیں۔ لہذا رسول اللہ کی اطاعت مستقل ہو گئی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کتاب اللہ کی اطاعت مستقل ہے۔ بلکہ کتاب اللہ کی اطاعت فرع ہے۔ رسول اللہ کی اطاعت کی اور رسول اللہ کی اطاعت مستقل حجت ہو گئی کتاب اللہ پر۔ غور کیجیے۔

اس آیت کے ترجمہ میں منکرِ حدیث نے حکم کے معنی حکومت کے کئے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ حکم کے معنی فہم کے ہیں بالاتفاق مفسرین اور نیز حضرت یحییٰؑ کی بابت اللہ نے فرمایا: وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (قال الم - مریم) ہم نے بچپن ہی میں اس کو یعنی یحییٰ کو فہم عطا کیا تھا۔ اگر حکم کے معنی حکومت کے ہوتے تو آیت کے معنی یہ ہوتے کہ ہم نے بچپن ہی میں یحییٰ کو حکومت دی تھی۔ حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ یحییٰؑ کو حکومت نہیں ملی تھی۔ اور یہاں ایک نکتہ ہے۔ اس کو سمجھ لینا چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر اللہ کہے کہ میری اطاعت کرو تو اس کہنے کے بعد وہ مطاع ہے۔ یعنی اللہ کی ذات بذاتہٖ مطاع ہونے کو نہیں چاہتی کیونکہ اس کی ذات ازلی ہے۔ اور تقاضائے ذات ذات سے جدا نہیں ہوتا۔ تو اگر ذات کا تقاضا مطاع ہونا ہو تو مطاع ہونا بھی ازلی ہو جائے

گا۔ اور مطاع کا تحقق مطیع کے بغیر نہیں ہو سکتا تو مطیع بھی ازلی ہو جائے گا۔ حالانکہ عالم اور مطیعین سب کے سب حادث ہیں، ازلی نہیں ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اللہ کی عبادت اور اطاعت اس وقت ہو گی جب وہ حکم دے گا۔ لہذا اللہ کا معبود ہونا اور مطاع ہونا اللہ کے حکم سے ہوا ہے نہ کہ اللہ کی ذات سے۔ یہی وہ دقیقہ ہے کہ جس پر لعین اوّل نہیں مطلع ہوا۔ یعنی وہ لعین یہ نہیں سمجھا کہ مسجود ہونے کی علت ذاتِ باری نہیں ہے بلکہ امر باری ہے۔ اسی طرح مطاع ہونے کی علت امرِ باری ہے نہ ذاتِ باری۔ جب اس نے یہ امر کیا۔ "اَطِيْعُوا اللهَ" اللہ کی اطاعت کرو تو محض اس امر کی بنا پر اللہ مطاع ہو گیا۔ پھر اس نے امر کیا۔ "اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ" تو محض اس امر کی بنا پر رسول مطاع ہو گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو علت مطاع ہونے کی اللہ کے لئے ہے۔ وہی علت مطاع ہونے کی نبی کے لئے ہے۔ پس جس طرح اللہ کی اطاعت اس امر کی بنا پر فرض ہے اسی طرح رسول کی اطاعت اس امر کی بنا پر فرض ہے۔ یعنی اگر اَطِيْعُوا اللهَ کا امر نہ ہوتا تو اللہ کی اطاعت فرض واجب نہ ہوتی۔ بالکل اسی طرح اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کا امر نہ ہوتا تو رسول کی بھی اطاعت واجب نہ ہوتی۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ فاعل بالذات نہیں ہے۔ فاعل بالارادہ ہے۔ کیونکہ یہ عقیدہ کفار فلاسفہ کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ذات اگر مقتضی مسجودیت ہوتی تو دائماً مسجود ہوتی حالانکہ اوقات مکروہہ میں سجدہ ممنوع اور حرام ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ نبی کا مطاع ہونا اس آیت اور کتاب اور کتاب اللہ سے ثابت ہوا۔ اور تم اوپر یہ بیان کر چکے ہو کہ نبی حجت ہے کتاب پر نہ کہ کتاب حجت ہے نبی پر اور یہاں تم نے یہ بیان کیا کہ امر الٰہی یعنی وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ نبی کے مطاع ہونے پر حجت ہے۔ تو اس کی کیا توجیہ ہے۔ تو ہم کہیں گے امر الٰہی حقیقت میں حجت ہے۔ امر الٰہی کبھی قول ہوتا ہے جیسے وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ہیں۔ کبھی فعل ہوتا ہے اور وہ فعلِ الٰہی معجزہ ہے۔ جس نے نبی کو مطاع بنایا۔ محض اس

امر فعلی اعجازی کی بناء پر نبی مطاع بنا ہے اور یہ امر قولی اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ اس امر فعلی اعجازی کی تاکید ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ معجزہ یعنی امر فعلی اعجازی نبی پر حجت ہوا اور نبی قرآن کے تعین پر حجت ہوا۔ اور قرآن نے نبی کے مستقل مطاع ہونے پر مزید تاکید کر دی۔ نبی کی صداقت قرآن پر موقوف نہیں ہے، بلکہ قرآن کا معین ہونا یعنی قرآن کا قرآن ہونا نبی کی صداقت پر موقوف ہے۔ اور نبی کی صداقت، نبی کا مطاع ہونا، نبی کا حجت ہونا یہ سب معجزہ پر موقوف ہے۔ جو امر الٰہی فعلی ہے یعنی اللہ کے اس فعلی معجزہ نے یہ حکم دیا کہ یہ مدعیٔ نبوت سچا ہے۔ بس غور کرو کہ نبی کا قول فعل سب اسی طرح حجت ہے جس طرح خدا کا فعل حجت ہے۔ جس طرح خدا کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ عقل کے مطابق ہو۔ بالکل اسی طرح نبی کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ نبی کا قول بھی قول اللہ ہے۔ اور قرآن بھی قول اللہ ہے۔ اور اللہ کے دونوں قول ہیں۔ قرآن بھی اور حدیث رسول بھی۔ تو اللہ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں تنوع نہ ہو۔ جس طرح کہ اس کے ایک فعل کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے فعل کے مطابق ہو۔ ایک طرف پہاڑ کی چوٹی فلک تک پہنچ رہی ہے۔ دوسری طرف کھڈ کی گہرائی تحت الثریٰ تک پہنچ رہی ہے جس طرح اس کے ایک فعل کا دوسرے فعل کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح اس کے ایک قول کا یعنی حدیث رسول کا اس کے دوسرے قول یعنی قرآن کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہاں مغالطہ ہوا ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نبی چونکہ بشر ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کا قول خدا کے قول کے مطابق ہو۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے نبی کا قول درحقیقت خدا کا قول ہے۔ قرآن بھی وحی ہے اور نبی کا قول بھی وحی ہے جیسا کہ پہلے صفحات میں ثابت کر دیا گیا ہے۔ "وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی (قال فما خطبکم

النجم) اس کا نطق اس کی خواہش سے نہیں ہے۔ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (قال فما خطبکم۔ النجم) وہ تو صرف وحی ہے جو وحی کی گئی۔ اب اگر کوئی کہے کہ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللہُ (لا یحب اللہ۔ المائدہ) کے کیا معنی ہیں۔ نبی سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تو کتاب اللہ کے ساتھ ان کے درمیان حکم کر تو اس کا جواب یہ ہے کہ مَا اَنْزَلَ اللہ کے معنی صرف کتاب اللہ کے نہیں ہیں بلکہ مَا اَنْزَلَ اللہ کتاب اللہ بھی ہے اور حدیث رسول اللہ بھی ہے۔ غور کرو کہ صبح کے دو فرض اور ظہر کے چار فرض اور عصر کے چار فرض اور مغرب کے تین فرض اور عشا کے چار فرض، یہ سب نبی نے بتائے ہیں اور کتاب اللہ میں کہیں یہ تفصیل نہیں ہے اور نہ یہ تعداد ہے۔ تو اب یا تو یہ کہو کہ یہ پانچوں نمازیں اور ان کے اوقات و تعداد کا حکم نہیں۔ کیونکہ کتاب اللہ میں نہیں ہیں۔ تو اس صورت میں صرف کفر ہی نہیں بلکہ جنون بھی شامل ہے۔ اور اگر یہ کہو کہ یہ قطعی حکم الٰہی ہے تو ضرور بالضرور قرآن کے علاوہ یہ حکم نبی پر نازل ہوا اور نبی نے مَا اَنْزَلَ اللہُ کے ساتھ حکم کر دیا ہے۔ منکر حدیث نے رسالہ "اطاعت رسول" میں کہا ہے:۔

" اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ " (وما من دابۃ۔ یوسف)

کے معنی یہ ہیں کہ اس نے حکم دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو اور کہا ہے کہ قرآن کی رو سے خدا کی محکومیت اور خدا کی عبادت سے مراد ایک ہی ہے یعنی قوانین خداوندی کی اطاعت میں کہتا ہوں کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں اور اس کے نزدیک لَا تَعْبُدُوْا کے معنی لَا تُطِیْعُوْا کے ہیں۔ یعنی عبادت اور اطاعت ایک ہی چیز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ عبادت کا اطاعت ہونا بالکل غلط ہے۔ عبادت بتوں کی ہوتی ہے۔ جنوں کی ہوتی ہے۔ یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ (ومن یقنت۔ سباء) یعنی جنوں کی عبادت کرتے ہیں۔ اور ملائکہ کی

عبادت ہوتی ہے۔ مسیح علیہ السلام کی عبادت ہوتی ہے، سورج کی عبادت ہوتی ہے۔ غرضیکہ متعدد عبادتیں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اطاعتیں نہیں ہوتیں یعنی بتوں کا کوئی مطیع نہیں ہوتا۔ اسی طرح ملائکہ وعیسیٰ علیہ السلام وغیرہ کا کوئی مطیع نہیں ہے لیکن عابد ہے تو معلوم ہوگیا کہ مطیع اور چیز ہے اور عابد اور چیز ہے اور نیز رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ لیکن رسول کی اطاعت اللہ کی عبادت نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ اطاعت علیحدہ چیز ہے۔ اور عبادت علیحدہ چیز ہے۔ یہ ایک زبردست مغالطہ ہے جس میں لوگ پھنس گئے ہیں۔

حدیث کا جو معتبر مجموعہ ہمارے پاس ہے وہ یقینی ہے یا نہیں؟

سوال: کیا احادیثِ رسول کا جو معتبر مجموعہ ہمارے پاس ہے وہ یقینی ہے یا ظنّی۔؟

جواب: وہ ظنّی ہے۔ بخاری، مسلم وغیرہ میں جو احادیث ہیں وہ ظنّی ہیں۔

---

(۴)

ظن شرعاً حجّت ہے یا نہیں؟

سوال: کیا ظن شرعاً حجت ہے یا نہیں؟

جواب: ظن شرعاً بھی حجّت ہے اور عقلاً بھی حجت ہے۔ ظن کے حجت ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ظن عمل کو واجب کر دیتا ہے۔ یعنی ظن موجب عمل ہے۔ موجبِ ایمان نہیں ہے۔

ظن کے معنی: پہلے ظن کے معنی سمجھ لینے چاہئیں۔

جب حکایت ذہن میں آتی ہے تو اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ذہن اس کے صدق وکذب کی طرف ملتفت ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اگر حکایت کے ذہن میں آنے کے بعد ذہن اس کے صدق وکذب کی طرف ملتفت نہیں ہوا تو اس کو "تخییل" کہتے ہیں اگر ملتفت ہوا تو کسی ایک طرف یعنی فقط صدق یا فقط کذب کی طرف ملتفت ہوا یا دونوں کی طرف ملتفت ہوا۔ اگر فقط ایک طرف التفات ہوا تو یہ یک طرفہ

التفات" جزم" یا "قطع" کہلاتا ہے۔ اور اس کی تین صورتیں ہیں اور وہ یہ ہیں کہ یہ یک طرفہ التفات واقع کے مطابق ہے یا واقع کے مطابق نہیں ہے۔ یعنی واقع میں یہ حکایت بالکل صادق تھی ذہن نے اس کو بالکل کاذب جانا یا واقع میں بالکل کاذب تھی ذہن نے بالکل صادق جانا۔ تو اگر یک طرفہ التفات واقع کے خلاف ہے تو اس کو "جہل مرکب" کہتے ہیں۔ اور اگر واقع کے مطابق ہے تو اس التفات اور اس اعتقاد کا زوال یا تو ممکن ہے یا ناممکن ہے۔ اگر ممکن الزوال ہے تو یہ یک طرفہ التفات جو واقع کے بھی مطابق ہے اور ممکن الزوال بھی ہے۔ "تقلید" کہلاتا ہے۔ اور اگر ناممکن الزوال ہے تو یہ یک طرفہ التفات جو واقع کے مطابق بھی ہے اور اس کا زوال بھی ناممکن ہے۔ اس یک طرفہ التفات و اعتقاد کو "یقین" کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ یک طرفہ التفات کی تین قسمیں ہیں: (۱) جہل مرکب (۲) تقلید (۳) یقین۔

اسی طرح دو طرفہ التفات کی بھی تین قسمیں ہیں۔ یہ دو طرفہ التفات دونوں طرف اگر برابر برابر ہے تو اس کو "شک" کہتے ہیں اور اگر کم اور زیادہ ہے تو جدھر کم ہے اس کو "وہم" کہتے ہیں اور جدھر زیادہ ہے اس کو "ظن" و "گمان" کہتے ہیں مثلاً فلاں حکایت ظنی الصدق ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ صدق کی طرف زیادہ التفات ہے اور کذب کی طرف کم التفات ہے یا فلاں حکایت ظنی الکذب ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کذب کی طرف زیادہ التفات ہے۔ صدق کی طرف کم التفات ہے۔ اب جب کہ ظن کے معنی معلوم ہو گئے تو اب یہ دیکھنا ہے کہ ظن عمل کو واجب کرتا ہے یا نہیں۔ سو معلوم کرنا چاہئیے کہ یقین میں ایسی زیادتی ہے جو بالکل یک طرفہ ہے اور دوسری طرف کمی بالکل نہیں ہے۔ صرف ایک ہی طرف زیادتی ہی زیادتی ہے اور ظن میں ایسی زیادتی ہے کہ دوسری طرف کچھ کمی ہے۔ بہر حال زیادتی میں اور رجحان میں دونوں برابر ہیں اور عمل کو واجب کرنے والی چیز زیادتی ہے نہ کہ کمی۔ تو جس طرح یقین بوجہ زیادتی کے موجب

عمل ہے۔ بالکل اسی طرح ظن بوجہ زیادتی کے موجب العمل ہے یعنی یقین موجب عمل کیوں ہے؟ صرف اس وجہ سے کہ اس میں زیادتی ہے۔ ایسی زیادتی کہ جس میں کمی کا احتمال نہیں ہے۔ تو یقین میں موجب عمل "زیادتی" ہے۔ نہ کہ کمی کا احتمال نہ ہونا لہٰذا حجت صرف "زیادتی" ٹھہری اور یہ ظن میں موجود ہے۔ لہٰذا جس بنا پر یقین حجت ہے وہی بنا ظن کے حجت ہونے کی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ عمل کرنے کے لئے اس عمل کے حسن کا تصور چاہئیے اور یہ تصور جس طرح یقین میں ہے اسی طرح ظن میں ہے کیونکہ ظن میں رجحان موجود ہے اور یہ رجحان ہی عمل کرانے کیلئے کافی ہے لہٰذا ظن و یقین ایک بنیاد پر حجت ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر صرف یقین حجت ہوگا نہ ظن، تو عالم میں کہیں بھی ناکامی نہیں ہوگی اور ناکامی مفقود ہو جائے گی۔ کیونکہ جب انسان کو یقین ہو گیا کہ یہ عمل نافع ہے تو نفع اور فائدہ اور کامیابی لازمی طور پر ہوگی اور نقصان اور نامرادی مفقود ہو جائے گی۔ حالانکہ عالم میں ناکامی اور کامیابی، نفع و نقصان دونوں متحقق ہیں۔ لہٰذا معلوم ہو گیا کہ صرف یقین پر مدارِ عمل نہیں ہے بلکہ ظن عمل کے لئے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض صورتوں میں ناکامی ہوتی ہے۔

ظن کے حجت ہونے کی حسی مثالیں

دنیا کے تمام قسم کے معاملات اور کاروبار میں مثلاً تجارت کا عمل ظن پر موقوف ہے۔ ہر تجارت میں نفع نہیں ہوتا اگر یقینی نفع تجارت کرنے کی علت ہوتا تو گھاٹا کسی کو نہ ہوتا بلکہ ظنی نفع حجتِ عملِ تجارت ہے۔

(۱) اسی طرح مزدوری کا معاملہ ہے۔ اگر مزدور کو یقین ہوتا کہ بازار جا کر مزدوری یقیناً مل جائے گی۔ تو کوئی مزدور بیکار نہ ہوتا۔ صرف مزدوری کا ظن اس کو بازار لاتا

ہے۔ اکثر اوقات مزدوری مل جاتی ہے۔ کبھی نہیں بھی ملتی۔

(۲) اسی طرح نوکری کا حال ہے اور اسی طرح ڈاکٹری کا حال ہے۔ ڈاکٹر کو قطعاً یہ یقین نہیں ہوتا کہ اس کی دوا سے شفا ہوگی۔ اگر ایسا ہوتا تو تمام مریض شفایاب ہوتے۔ ڈاکٹر کو صرف ظن ہوتا ہے اور وہ اپنے ظن پر دوا دیتا ہے۔ کبھی شفا ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر کا عمل اور دوا کا عمل دونوں ظنی ہیں۔

اب اگر ظن موجبِ عمل نہ ہو تو معالجہ ہی ختم ہو جائے اور کوئی علاج ہی نہ کرے اور کرائے۔ اسی طرح سفر خواہ پیدل کرے یا سواری میں کرے، موٹر، ریل، ہوائی جہاز گھوڑا گاڑی غرض کسی طرح بھی سفر کرے اس کو یہ یقین نہیں ہوتا ہے کہ وہ بخیر و عافیت منزل پر پہنچ جائے گا صرف ظن ہی ہے۔ اب اگر ظن موجبِ عمل سفر نہ ہو تو سفر ہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی طرح ہوائی جہاز، ریلیں وغیرہ ہیں کسی کو بھی یقین نہیں ہے کہ ان سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور فائدہ ہی فائدہ ہوگا۔ بلکہ ظن غالب ہے کہ فائدہ ہوگا۔ کبھی نقصان بھی ہو جائے گا۔ اب اگر ظن مفید عمل نہ ہو تو تمام صنعتیں باطل ہو جائیں گی۔ غرض یہ ہے کہ دنیا میں کوئی عمل ایسا نہیں ہے کہ جس کا دار و مدار ظن پر نہ ہو سب کا ظن ہی پر دار و مدار ہے۔ اب اگر ظن مفید عمل اور موجب عمل اور حجتِ عمل نہ ہوگا تو نظام عالم تباہ ہو جائے گا۔ کیونکہ کسی کو کسی عمل کے حسنِ انجام کا یقین نہیں ہے۔ صرف ظن ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (قد افلح۔ المومنون) یعنی اگر ان کی رائے کے حق تابع ہوگیا تو آسمان اور زمین اور جو اس میں ہیں سب تباہ ہو جائیں گے۔ اور حق ان کی رائے کے تابع ہوا تو نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

آیت سے یہ ثابت ہوگیا کہ عالم کی بربادی کا سبب حق کا ان کی رائے کا تابع ہونا ہے۔ اور مشاہدہ سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی بربادی کا سبب ظن کا حجت نہ ہونا

ہے۔ تو گویا ظن کا حجت نہ ہونا، حق کا ان کی رائے کے تابع ہونا ہے لہٰذا اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ ظن حق ہے اور موجب بقائے عالم ہے۔ اور ان کی رائے کے تابع ہوکر یعنی ظن نہ حجت بن کر موجب فساد عالم ٹھہرا۔ غور کا مقام ہے۔

تم مجھے بتاؤ تو سہی کہ جہاں میں کونسا عمل یقین پر ہو رہا ہے۔ سب کام ظن ہی پر چل رہے ہیں۔ اب ہم یہ بتاتے ہیں کہ اعمالِ شرع صرف ظن ہی پر ہیں۔ ہاں بیشک ایمان یقین پر ہے۔ بلکہ یقین ہی ہے۔ دیکھو ہر شخص جو کہ نیک کام کرتا ہے اس کی غایت یہ ہوتی ہے کہ عذاب سے رہائی ہو۔ جنت کی راحتیں اور ثواب حاصل ہو۔ تو بتاؤ کہ کسی شخص کو بھی یقین ہے کہ وہ عذاب جہنم سے بچ جائے گا اور جنت میں داخل ہو جائے گا۔ سب کو ظن ہی ہے۔ سب اس گمان اور ظن پر عمل کر رہے ہیں کہ شاید عذاب سے رہائی ہو جائے اور ثواب حاصل ہو جائے۔ سوائے انبیاء کے سب کو ظن ہی ظن ہے۔ اب اعمالِ شرعیہ کی مثالیں لیجیے۔

اعمالِ شرعیہ کی مثالیں

نکاح کا دار و مدار دو آدمیوں کی شہادت پر ہے۔ اور دو آدمیوں کی شہادت ظنی ہے۔ شریعت نے اس ظن کو حجت قرار دیا ہے اسی طرح زنا کی سزا کی شہادت چار آدمیوں کی ہے۔ چار آدمیوں کی شہادت ظنی ہے۔ شرع نے اتنی سخت سزاؤں پر ظنی شہادت کو حجت قرار دیا۔ باپ کا باپ ہونا ظنی ہے۔ شرع نے اس کو حجت قرار دیا یعنی نسب ظنی ہے۔ اور احکام میراث اسی ظن پر ہیں۔ اسی طرح سجدہ کعبہ کے سامنے ہونا چاہئے اور موضع سجود سے جو خط سیدھا کعبہ کو جائے وہ ظنی ہے یقینی نہیں ہے۔ اسی طرح سحری اور افطار دونوں ظنی ہیں یہ نہیں معلوم کہ صحیح وقت پر سحری کھائی گئی اور صحیح وقت پر افطار کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَاسْتَشْهِدُوْا

اشْهِدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ (تلك الرسل۔ البقرۃ) یعنی دو مردوں کو گواہ بنالو اور دو مردوں کی شہادت ظنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حجت قرار دیا ہے۔ "وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ" (قد افلح۔ النور) جو لوگ پارسا عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں پھر چار شاہد نہیں لاتے اور فرمایا: "لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ" (قد افلح۔ النور) کیوں نہیں چار گواہ اس پر لے آئے۔ ان آیتوں میں چار گواہوں کی گواہی کو سزا کے لئے حجت قرار دیا۔ حالانکہ چار گواہوں کی گواہی یقینی نہیں بلکہ ظنی ہے۔ الغرض جتنے بھی اعمالِ صالحہ ہیں اکثر و بیشتر پر قرآن نے ظن کو حجت رکھا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا: "لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ" (یعتذرون۔ یونس) تاکہ تم کو سالوں اور برسوں کی گنتی اور حساب معلوم ہوجائے۔ "مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ" (یعتذرون۔ یونس) اللہ نے اس کو یعنی حساب کو ناحق نہیں بنایا اور "وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا" (تبارك الذی۔ الجن) ہر چیز کو عدد سے گھیر لیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حساب حق ہے اور جبکہ حساب حق ہے تو وہ شے کہ جس پر حساب موقوف ہے وہ حق ہے۔ اور وہ علم ہندسہ کی یہ شکل ہے کہ اگر چار مقداریں متناسب ہوں یعنی پہلی مقدار کو دوسری مقدار سے وہی نسبت ہو جو تیسری کو چوتھی سے ہے تو پہلی اور چوتھی کا حاصل ضرب دوسری اور تیسری کے حاصل ضرب کے برابر ہوگا۔ تمام قوانین حساب سوائے جمع اور تفریق کے کل کے کل اسی شکل کی فرع ہیں۔ ہم نے دوسری جگہ اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ علم حساب اشکالِ ہندسیہ کا نتیجہ ہے اور جبکہ حساب اشکال ہندسیہ پر موقوف ہے تو لابد جس طرح حساب حق ہے بالکل ہندسہ جو موقوف علیہ حساب ہے وہ بھی حق ہے اور جب ہندسہ حق ہے تو لابد جس شے پر ہندسہ موقوف ہے وہ بھی حق ہے اور وہ شے اصل موضوع ہے یعنی دو نقطوں میں خط ملا سکتے ہیں۔ خط

کو جتنی دور تک چاہیں بڑھا سکتے ہیں۔ کسی نقطے کو مرکز فرض کر کے جتنی دوری سے چاہیں دائرہ بنا سکتے ہیں۔ یہ تین اصل موضوع ہیں ان پر تمام مقالات ہندسیہ موقوف ہیں۔ اور یہ تینوں یقینی نہیں ہیں۔ کیونکہ اگر یہ بداہۃً یقینی ہوتے تو علوم متعارفہ میں داخل ہوتے جو بداہۃً یقینی ہیں اور اگر یہ نظراً یقینی ہوتے تو دیگر مسائل نظریہ کی طرح یہ بھی اشکال نظریہ میں شامل ہوتے اور اشکال نظریہ کی طرح ان کو بھی ثابت کیا جاتا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ نہ تو بارہ علوم متعارفہ میں ان کا شمار ہے۔ نہ کسی مقالہ کی کسی شکل میں ان کا بیان ہے صرف معلم ہندسہ کے حسنِ ظن سے ان کو تسلیم کر لیا ہے اور یہ ظنی ہیں۔ لہذا اگر ظن حجت نہ ہوتا تو اس ظن پر جتنی چیزیں موقوف ہیں وہ حجت نہ ہوتیں نہ ہندسہ کی اشکال نہ حساب مگر اللہ تعالےٰ نے حساب کو حق کہا ہے تو لابد ہندسہ بھی حق ہوا۔ اور ہندسہ ان تین اصل موضوع پر موقوف ہے۔ لہذا یہ تینوں اصول موضوع بھی حق ہوگئے اور یہ اصولِ موضوع ظنی ہیں۔ لہذا ظن حجت ہوگیا قرآن کی روشنی میں۔ بس اگر ظن حجت نہ ہوگا تو نظامِ عالم دینوی اور دینی سب درہم برہم ہوجائے گا۔ لہذا ظن حجتِ عمل ہے۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ" (حٰم۔ الحجرات) بیشتر ظنوں سے بچو کیونکہ بعض ظن گناہ ہیں۔ اور فرمایا: "اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ" (قال فما خطبکم۔ النجم) وہ صرف ظن اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کرتے ہیں اور فرمایا: "اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ" (الم۔ البقرۃ) وہ صرف اٹکل ہی سے کام لیتے ہیں۔ اور فرمایا: "اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا" (یعتذرون۔ یونس) یعنی ظن حق سے بے نیاز نہیں کرتا اور اٹکل سے صحیح بات کچھ بھی معلوم نہیں ہوتی۔ اور اس کے علاوہ ظن کی مذمت میں بے شمار آیات

ہیں۔ اس کا کیا جواب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ظن کے معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ ایک ظن تو یقین کا مقابل ہے جیسے کہتے ہیں "یہ ظنی ہے" "یہ یقینی علم ہے"۔ تو یہ ظن قسم علم ہے اور ایک ظن عمل ہے۔ یعنی عمل کی قسم ہے اور عملی ظن کی دو دو قسمیں ہیں۔ ایک سوئے ظن اور ایک حسن ظن۔ حسن ظن کی مثال "لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا" (قد افلح۔ النور) جب تم نے یہ سنا تھا تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے کیوں نہیں حسنِ ظن کیا۔ اور سوئے ظن کی مثال "اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ" اکثر ظنوں سے بچو۔ یعنی سوئے ظن سے بچو۔ لہٰذا عملی ظن کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک ظن بمعنی ظنِ خیر، جس کا حکم ہے، ایک ظن بمعنی سوئے ظن، جس کی نہی ہے۔

ہم جس ظن کو حجت قرار دے رہے ہیں وہ نہ حسنِ ظن ہے نہ سوئے ظن بلکہ وہ ظن ہے جو یقین کا مقابل ہے اور قسم علم ہے اور اس کے حجت ہونے کی اس آیت میں بھی دلالت موجود ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ" (رحم۔ الحجرات) اے ایمان والو! بہت سے ظنوں سے بچو۔ کیونکہ بعض گناہ ہیں۔ اس آیت میں بعض ظن کو گناہ بتایا اور اکثر سے بچنے کو فرمایا۔ اور ظاہر یہ بات تھی کہ بعض گناہ ہیں بعض سے بچنے کو فرماتا۔ لیکن اکثر سے بچنے کو یوں فرمایا کہ اکثر ظنوں کے جو مراتب ہیں ان میں یہ بعض جو گناہ ہے کونسا ہے لہٰذا مراتب اکثر سے بچو کیونکہ اصل میں تو بچنا بعض سے ہے جو گناہ ہے۔ اب ہو سکتا ہے کہ وہ بعض یہ ہوں یا وہ یا وہ، کیونکہ ظن ہے کہ وہ بعض جو اثم (گناہ) ہے یہ ہیں یا وہ ہیں۔ لہٰذا اگر ظن حجت نہ ہوتا اور صرف یقین حجت ہوتا تو صرف بعض ظن سے جو اثم تھا بچنے کو فرماتا اور اس کی وضاحت مثال سے ہو جائے گی۔ مثلاً ظنوں کی تعداد

ستّر ہے اس میں سے بعض گناہ ہیں مثلاً دس تو فرمایا کہ ستر سے بچو۔ بچنا تو صرف دس سے تھا۔ ستر سے بچنے کو اس لئے فرمایا کہ یہ دس جو بچنے کے قابل ہیں ان ستر یعنی سات دہائیوں میں سے کونسا دہایا ہے۔ کیونکہ یہ دہایا ہر سات دہائیوں میں سے کوئی سا ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ پہلا دہایا ہو، ممکن ہے دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا، ساتواں، غرضکہ ہر دہایا ممکن ہے جب ہر دہایا ممکن ہے تو ہر دہائے میں ظن ہو گیا تو یہ ظن حجت ہو گیا۔ اس بات پر کہ بعض سے بچنے کی بجائے اکثر سے بچا جائے ورنہ تقاضائے یقین تو یہ تھا کہ جو اثم ہے صرف اسی سے بچا جائے۔ لیکن اثم ہونے کا یقین تو بعض میں ہی ہے اور ظن اکثر میں۔ یعنی اثم اور گناہ ہونے کا ظن اکثر میں ہے اور اللہ کے نزدیک چونکہ ظن حجت ہے اس لئے ظن کے حجت ہونے کی بنا پر اس نے جہاں تک ظن کا اثر تھا سب کو یعنی اکثریت کو ممنوع قرار دے دیا۔ گویا آیت کا خلاصہ یہ ہوا۔ بعض ظن تو یقیناً اثم اور گناہ ہیں لیکن کثیر ظن اثم اور گناہ ظناً ہیں اور ظن حجتِ عمل ہے۔ لہٰذا اثم ظناً جو ظن اثم ہیں ان سے بچو نہ کہ صرف یقینی ظن سے۔ لہٰذا ظن حجت ہو گیا اور عقائد میں جو ظن کی مذمت کی ہے وہ صحیح ہے۔

عقیدہ کی بنیاد یقین ہے ظن سے یقین نہیں ہوتا اس لئے ظن کو بُرا کہا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ظن صرف موجب عمل ہے۔ موجب ایمان نہیں ہے۔ لہٰذا مسائل ایمانیہ میں ظن حجت نہیں ہوگا اور مسائل عملیہ میں ظن حجت ہوگا۔

اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اگر ظن حجت عمل نہ ہوگا تو بیشتر آیات پر عمل ہی نہیں ہو سکے گا۔ مثلاً "قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" (الیہ یرد۔ الشوریٰ) کہہ دے میں اس ہدایت پر تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا۔ بجز محبت قرابت کے۔ اب اس محبت قرابت سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ تم آپس میں اپنے اپنے قرابت داروں سے محبت کرو، یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ

میرے قرابت دار سے محبت کرو۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ مجھ سے بوجہ میری قرابت کے محبت کرو۔ اب اس آیت سے تین مُرادیں ہو سکتی ہیں اور اس کا یقین نہیں ہے کہ اللہ کی کونسی مُراد ہے یا سب مُرادیں ہیں۔ بہرحال ہر معنی ظنی ہیں اگر ظن حجت نہ ہو تو کتاب پر عمل نہ ہو سکے گا۔ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ (سیقول۔ البقرۃ) مطلقہ عورتوں کی عدت تین قرء ہے اور قرء حیض کو بھی کہتے ہیں۔ طہر کو بھی کہتے ہیں۔ حیض و طہر ہر ایک پر قرء کی دلالت ظنی ہے۔ یہ یقین نہیں ہے کہ اللہ کی مراد کیا ہے۔ حیض ہے یا طہر ہے۔

"وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ" (تبارک الذی۔ الحاقۃ) اس روز تیرے رب کے عرش کو اپنے اوپر آٹھ اٹھائے ہوں گے۔ اب یہاں عدد آٹھ کا ہے اور معدود ظنی ہے پتہ نہیں کون سے آٹھ اٹھائے ہوں گے۔ اللہ کی کیا مُراد ہے۔ آٹھ فرشتے مراد ہیں یا کوئی اور آٹھ مُراد ہیں یا سات آسمان اور ایک زمین مُراد ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اکثر آیات کی دلالت ان آیات کے معنی پر ظنی ہے۔ اگر ظن حجت نہ ہو گا تو بیشتر آیات پر عمل ہی نہیں ہو سکے گا۔

——— x ———

(۵)

احادیث مُسلّمہ واجب العمل ہیں یا نہیں؟

سوال: کیا خبر واحد حجّت ہے۔ یعنی موجب عمل ہے یا نہیں؟ یعنی مجموعہ احادیث جو اس وقت بخاری و مسلم وغیرہ میں موجود ہے۔ یہ احادیث حجت ہیں یا نہیں۔؟

جواب: ہاں خبر واحد حجت ہے اور موجب عمل ہے۔

ثبوت: اگر خبر واحد موجب عمل نہ ہوگی تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ لیکن نظام عالم باقی ہے۔ قائم ہے۔ لہٰذا خبر واحد یعنی حدیث حجت ہے اور موجب عمل ہے اور حدیث پر عمل کرنا واجب ہے۔

پہلی دلیل: اب اس بات کا ثبوت کہ اگر خبر واحد حجت اور موجب عمل نہ ہو گی تو نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی اپنی زندگی باقی رکھنے میں دوسروں کا محتاج ہے اور اس احتیاج کو رفع کرنا اور دفع کرنا اس بات پر موقوف ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کا دوسروں پر اظہار کرے اور اظہار کا طریقہ یعنی مافی الضمیر کا اظہار پوری طرح صرف خبر اور حکایت ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ تو گویا انسان کی زندگی خبر اور حکایت پر ہی موقوف ہے۔

خبر متواتر: خبر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو خبر متواتر جو یقینی ہے جیسے کہا جائے کہ قاہرہ دمشق مکّہ وغیرہ یہ شہر ہیں تو جن لوگوں نے ان کو نہیں دیکھا ان کو بھی بہ خبر متواتر ان کے شہر ہونے کا ایسا ہی یقین ہے۔ جیسا کہ ان کے دیکھنے والوں کو ان کے شہر ہونے کا یقین ہے۔

خبر واحد: خبر کی دوسری قسم خبر غیر متواتر یعنی جو خبر متواتر نہیں ہے۔ اسی کو خبر واحد کہا جاتا ہے۔ اور ہماری مُراد واحد کی خبر سے وہ خبر ہے جو متواتر نہ ہو۔ بہر حال چونکہ انسان کی زندگی کا دارو مدار خبر پر ہے۔ اور خبر یا متواتر ہے یا غیر متواتر۔

خبر متواتر پر ہر عمل دشوار بلکہ تقریبًا محال ہے۔ کیونکہ خبر متواتر اس خبر کو کہتے ہیں کہ اتنی کثیر جماعت کہ جس کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلاً محال ہو وہ واقعہ کو محسوس کرے یا مشاہدہ کرے پھر دوسروں کے سامنے اس طرح نقل کرے کہ اس کی تعداد کم نہ ہونے پائے تو ایسی خبر کا تحقق انسان کے اعمال میں تقریبًا محال ہے تو لابد انسان کے عمل کرنے کے لئے صرف غیر متواتر یعنی خبر واحد ہی موجب ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اگر خبر واحد موجبِ عمل نہ ہوگی تو اعمالِ انسانی کا خاتمہ ہو جائے گا اور نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان عمل کرنے میں خبر کا محتاج ہے۔ اور خبر متواتر جو یقینی اور قطعی ہے۔ اس کا تحقق دشوار بلکہ تقریبًا محال ہے تو لابد خبر واحد جو غیر یقینی اور ظنی ہے وہی موجب عمل ہوگی۔ مثلاً ایک شخص نے ایک شخص کو منع کیا کہ آگے نہ بڑھنا دیوار گرنے والی ہے۔ اب اگر وہ کہے کہ تیری خبر تجھ اکیلے کی ہے یعنی خبر واحد ہے۔ اور خبر واحد ظنی ہے۔ اور میں تو یقین پر عمل کروں گا۔ اور یقین حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دیوار کے گرنے کا مشاہدہ یا احساس جم غفیر اور ایسی کثیر جماعت نہ کرے جس کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلاً محال ہو۔ ایسی جماعت کثیرہ کا تحقق اس وقت محال اور ناممکن ہے۔ لہٰذا یقین تو حاصل ہونے سے رہا اور اس نے منع کرنے والے کی خبر پر عمل کیا نہیں اور آگے بڑھ گیا اور دیوار کے نیچے دب کر مر گیا۔ لہٰذا خبر واحد پر عمل نہ کرنا موجبِ ہلاکت ہو گیا۔

دوسری دلیل: فائدہ حاصل کرنے سے نقصان سے بچنا مقدم ہے یعنی خبر واحد اگر واقع میں نبی کا قول ہے تو اس پر عمل کر کے ترک عمل کے عذاب سے بچنا ہے اور اگر نبی کا قول نہیں ہے تو عمل کرنا بے فائدہ ہے۔ بہر حال عمل کرنے میں دفع مضرت ہے۔

تیسری دلیل: جب غور و فکر کر کے انسان اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ خبر واحد حجت نہیں ہے۔ اور عمل کو واجب نہیں کرتی تو اب قصداً اس بات کا کرے گا کہ خبر واحد پر عمل ترک کرے یعنی اب قصد ترک عمل کا ہوگا۔ اور قصد ترک عمل بھی عمل ہے تو اس عمل کا موجب وہم ہوگا۔ یعنی خبر واحد پر عمل تو ظن اور راجح کی بنیاد پر ہوتا اور یہ ترکِ عمل ظن اور راجح کے مقابل کی چیز یعنی وہم اور مرجوح پر ہوا تو جب کہ عمل وہم جو ظن سے کمزور ہے اس پر روا ہو گیا تو ظن جو وہم سے بہت قوی ہے اس پر بدرجۂ اولیٰ ہونا چاہیئے۔

چوتھی دلیل: قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قطعی ہونا عمل کو واجب کر رہا ہے اور عمل کے قطعی واجب ہونے کا حکمِ الٰہی ہونا لازم ہے۔ تو قولِ رسول کے ظنی ہونے کو حکمِ الٰہی کا ظنی ہونا لازم ہے۔ اور حکمِ الٰہی کا ظنی ہونا قطعًا موجبِ عمل ہے۔ لہٰذا قولِ رسول جو ظنی ہے قطعًا موجبِ عمل ہو گیا۔ اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ قول جس کا قطعًا علم ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا قول ہے۔ اس قول پر قطعی عمل واجب ہے اور عمل کا قطعی واجب ہونا یہ بتا رہا ہے کہ یہ قطعی اللہ کا حکم ہے۔ تو قولِ رسول کو حکم الٰہی ہونا لازم ہو گیا۔ یعنی قولِ رسول ملزوم ہے اور حکمِ الٰہی ہونا لازم ہے اور قولِ رسول کے ظنی ہونے کو حکمِ الٰہی کا ظنی ہونا لازم ہے۔ اور حکم الٰہی کے ظنی ہونے کو قطعًا وجوب عمل لازم ہے۔ یعنی جب یہ علم ہو جاتے کہ یہ اللہ کا حکم ہے ظنًا۔ تو اس ظنی حکم الٰہی پر عمل

واجب ہے قطعاً۔

پانچویں دلیل: رسول کا قطعی قول قطعی حکم الٰہی ہے اور قطعی واجب العمل ہے اور رسول کا ظنی قول ظنی حکمِ الٰہی ہے۔ اور ظنی حکم الٰہی بھی قطعی حکمِ الٰہی کی طرح واجب العمل ہے۔ اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ عمل کا واجب ہونا حکمِ الٰہی پر موقوف ہے خواہ وہ حکمِ الٰہی قطعی ہو یا ظنی ہو جیسا کہ ظاہر قرآن پر عمل واجب ہے اور بیشتر آیات کی دلالت اپنے معنی پر ظنی ہے لیکن عمل واجب ہے تو وجوب عمل کی علت صرف حکم الٰہی ہونا ثابت ہوئی۔ خواہ وہ حکمِ الٰہی قطعی طور پر معلوم ہو یا ظنی طور پر معلوم ہو ہر صورت میں قطعاً واجب العمل ہے۔ اور قرآن کی آیات کے ظنی ہونے کے یہ معنی ہیں کہ آیات کا جو مفہوم اور معنی مجتہد یا عالم نے سمجھے ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ کی مراد نہ ہو۔ اگرچہ آیات کا ثبوت قطعی ہے لیکن ان کی دلالت اپنے معنی پر ظنی ہے۔ تو جس طرح قطعی الثبوت ظنی الدلالت حکم الٰہی موجب عمل ہوگیا۔ بالکل اسی طرح ظنی الثبوت ظنی الدلالت یعنی خبر واحد اور حدیثِ رسول موجب عمل ہوگیا اور کوئی فرق باقی نہ رہا۔

چھٹی دلیل: تمام صحابہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ خبر واحد حجت ہے اور اگر خبر واحد حجت نہ ہوتی تو صحابہ رضی اللہ عنہم خبر واحد پر عمل نہ کرتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی نے حدیث بیان کی۔ الائمۃ من القریش امام قریش میں سے ہوگا۔ نحن معاشر الانبیاء لا نوث ولا نورث۔ ہم انبیاء کی جماعت نہ وارث ہوتی ہے اور نہ کوئی دوسرا ان کا وارث ہوتا ہے۔ والانبیاء یدفنون حیث یموتون اور انبیاء جہاں فوت ہوتے ہیں وہیں دفن ہوتے ہیں۔ یہ تمام حدیثیں حضرت ابوبکرؓ نے بیان کیں اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے بالاجماع ان احادیث کو قبول کرلیا۔ اور ان کا یہ اجماع ہم تک بالتواتر منقول ہے۔

ساتویں دلیل: تواتر سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک کو احکام کی تبلیغ کے لئے بھیجا۔ اگر خبر واحد حجت نہ ہوتی تو تبلیغ کا فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ بلکہ گمراہی حاصل ہوتی۔

آٹھویں دلیل: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ" (لیعتدون۔ التوبۃ) سب مومنوں کو نہیں چاہیئے کہ وہ (دین حاصل کرنے کے لئے رسول کی طرف) کوچ کریں۔ پھر (جتنے فرقے اپنی اپنی بستیوں میں تھے ان میں سے) ہر فرقہ کے ایک ایک طائفہ نے کیوں نہیں کوچ کیا۔ دین کو سمجھنے کے لئے۔ تاکہ وہ (دین کو سمجھ کر) جب (اپنے) وطن لوٹتا تو اپنی قوم کو ڈراتا اور وہ یعنی اس کی قوم والے ڈرتے۔

فرقہ کا لفظ تین پر بولا جاتا ہے۔ یعنی کم از کم تین پر بولا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے واجب کیا کہ ہر فرقہ یعنی ہر تین میں سے ایک طائفہ نکلتا اور تین میں سے جو نکلیں گے وہ یا تو دو ہوں گے یا ایک ہوگا۔ تو طائفہ یا ایک ہے یا دو ہیں بہرحال اس طائفہ کے ڈرانے یعنی اس طائفہ کے خبر دینے پر عمل کو واجب کیا یعنی جب یہ طائفہ اپنے وطن کو لوٹ کر جائے اور اپنی قوم کو ڈراتے اور خبر دے تو اس کی قوم کو اس طائفہ کی خبر پر عمل کرنا واجب ہے۔ آیت کا حاصل یہ ہے کہ یہ طائفہ تفقہ فی الدین کے لئے کوچ کرے پھر تفقہ حاصل کرکے اپنے وطن جب لوٹے تو اپنی قوم کو ڈرائے یعنی خبر دے اور خبردار کردے کہ اے قوم! رسول کی نافرمانی اور مخالفت سے ڈرو! اور اس کی قوم پر واجب ہے کہ وہ اس طائفہ کے ڈراوے کی خبر سن کر ڈرے اور اس طائفہ کی خبر پر عمل کرے۔

چونکہ طائفہ ایک کو اور دو کو شامل ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَ اِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا " (حٰمٓ ۔ الحجرات) اگر مسلمانوں کے دو طائفے لڑیں تو ان میں صلح کراؤ اور صلح جس طرح دو بڑی جماعتوں کی لڑائی میں واجب ہے اسی طرح دو فردوں کی لڑائی میں بھی واجب ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ایک فرد بھی طائفہ ہے لہذا طائفہ کا اطلاق ایک اور دو پر بھی صحیح ہے اور طائفے کے ڈراوے پر اور ڈرانے کی خبر پر جب اللہ تعالیٰ نے عمل واجب قرار دیا تو اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ قوم کے لئے خبر واحد شرعاً حجت ہے۔ یعنی اللہ نے واحد کی خبر کو قوم کے لئے حجت قرار دیا۔

نویں دلیل : اعمال حرکات و سکنات کو کہتے ہیں اور حرکات و سکنات لامحدود ہیں۔ یعنی کسی حد پر نہیں ٹھہرتے۔ یعنی انسان بے شمار عمل کرتا ہے۔ نیز عمل حالات کے اختلاف سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور عمل مختلف احوال میں مختلف احکام چاہتا ہے۔ لہذا احکام لاانتہا یعنی بے شمار ہو گئے اور نصوصِ قرآنی جو موجب احکام ہیں وہ محدود ہیں۔ لہذا اگر صرف نصوصِ قرآنی پر عمل کیا جائے گا تو بیشتر اعمال بے احکام کے رہ جائیں گے۔ یعنی بہت سے ایسے اعمال ہوں گے کہ جن کی حرمت علت جواز اور عدم جواز کے لئے کوئی ثبوت قرآن سے نہیں مل سکے گا اور اس وقت انسان کی زندگی ان اعمال کی موجودگی میں بیکار اور لغو ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا" (قد افلح ۔ المؤمنون) کیا تم یہ سمجھے ہوئے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار بنایا ہے۔ اب اگر حدیث پر عمل نہ ہوگا اور خبر واحد پر عمل نہ ہوگا تو انسان کی بیشتر خلقت عبث ہو جائے گی۔ لہذا حدیث پر عمل واجب اور ضروری ہے۔

دسویں دلیل : جھوٹی حدیث وضع کرنی حدیث کے حجت ہونے کی حجت ہے۔ یعنی جعلی سکہ جب ہی ڈھالا جائے گا جب کہ ٹکسالی سکہ چالو ہو اور جبکہ اصلی

سکہ چالو نہ ہو تو جعلی بنانا بالکل بے سود ہوگا۔ چونکہ حدیث کی حجیت چالو تھی اس لئے جعلی حدیث وضع کی گئی۔ اگر حدیث کی حجت تمام مسلمانوں میں چالو نہ ہوتی تو وضاعین کو جعلی اور نقلی حدیث کے وضع کرنے سے کوئی فائدہ ہی نہ ہوتا۔

گیارہویں دلیل : اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے۔" وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ " (امن خلق ۔ القصص) ایک شخص شہر کے پرلے کنارے سے دوڑتا ہوا آیا اور کہا اے موسیٰ اہلِ دربار تیرے قتل کرنے کا مشورہ کر رہے ہیں۔ سو تو نکل جا۔ میں تیرا خیر خواہ ہوں۔ اگر واحد کی خبر قابلِ قبول اور موجب عمل نہ ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام اس کی خبر سے باہر نہ جاتے اور اسی طرح جب عورت بلانے آئی تھی اور اس نے کہا تھا " اِنَّ اَبِيْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا " (امن خلق ۔ القصص) میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے تاکہ تجھ کو پانی پلانے کا بدلہ دیوے۔ اس ایک عورت کی خبر اگر قابلِ قبول نہ ہوتی تو حضرت موسیٰ اس کے ساتھ نہ جاتے۔ پھر جب اس عورت کے باپ کے پاس پہنچے اور ان سے سارا واقعہ بیان کیا تو اس عورت کا باپ یہ نہ کہتا کہ فکر نہ کر تو ظالم لوگوں سے بچ نکلا۔ یعنی حضرت موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ سے سارا واقعہ بیان کیا اور انہوں نے ان کی خبر سن کر تصدیق کی اور ان کو مطمئن کیا اور فرعون والوں کو ظالم قرار دیا تو اگر خبر واحد قابل قبول نہ ہوتی تو حضرت موسیٰؑ جو ابھی نبی نہیں ہوئے تھے ان کی خبر کو حضرت شعیبؑ قبول نہ کرتے اور اسی طرح فرعون والوں میں سے جو مومن مرد اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتا تھا اس نے کہا اے میری قوم میری پیروی کرو میں تم کو بھلائی کا راستہ دکھلاتا ہوں۔ وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ (فمن اظلم ۔ المومن) اس ایک شخص

کی اتباع ہدایت ہے اگر اس کی اتباع اس کا قول قابل قبول نہ ہوتا تو کس طرح سیدھے راستے کی ہدایت ہوسکتا تھا۔ پھر اس شخص نے کہا فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ (فمن اظلم المومن) عنقریب تم کو میرا کہنا اور میرا قول یاد آئے گا (تم میری بات یاد کروگے) اگر اس کا قول حجت نہ ہوتا تو کیوں کر یاد آتا۔ اور اس کا قول حجت نہ ہوتا تو اس کے نہ ماننے سے آلِ فرعون کو عذاب نہ گھیرتا اس سے معلوم ہوگیا کہ خبر واحد قابلِ قبول اور حجت ہے قرآن کی رُو سے۔

بارھویں دلیل: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ (ومن یقنت۔ یٰسٓ) شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ اس نے کہا اے میری قوم رسولوں کی پیروی کرو۔ اگر اس شخص کا قول اس کی قوم پر حجت نہ ہوتا تو اس شخص کی نافرمانی پر اس کی قوم عذاب کی مستحق نہ ہوتی اور عذاب کی ایک ہی چنگھاڑ میں وہ جل بجھ کر راکھ نہ ہوجاتی۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ خبر واحد قرآن کی رُو سے حجت ہے۔

تیرھویں دلیل: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا (حٰمٓ۔ الحجرات) اگر تمہارے پاس فاسق خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ فاسق کی خبر قابلِ تحقیق ہے نہ قابلِ ردّ۔ یعنی اگر عادل خبر لائے تو قبول کرلو اور فاسق خبر لائے تو بلا تحقیق قبول نہ کرو۔ یعنی فاسق کی خبر بھی قابلِ رد نہیں ہے بلکہ قابلِ تحقیق ہے لہٰذا عادل کی خبر بغیر تحقیق قابلِ قبول ہے قرآن کی رُو سے۔

چودھویں دلیل: خبر واحد حجت نہیں ہے۔ یہ بات قرآن سے ثابت نہیں ہے۔ خبر واحد حجت ہے۔ یہ بات قرآن سے ثابت ہے، حدیث سے ثابت ہے۔ عقل سے ثابت ہے۔ اجماع سے ثابت ہے۔ تمام محدثین سے ثابت ہے، تمام مجتہدین

سے ثابت ہے تمام ائمہ محققین سے ثابت ہے۔ اب بتاؤ کہ جو بات کسی ذریعہ سے ثابت نہیں ہے وہ قابل قبول ہے یا وہ بات جو ہر ذریعہ سے ثابت ہے، وہ قابل قبول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (سبحٰن الذی بنی اسرائیل) جس چیز کا علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔

لہٰذا یہ کہنا کہ خبر واحد حجت نہیں ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ جس کا کسی ذریعہ سے علم نہیں ہے۔ اس لئے اس کے پیچھے نہ پڑنا چاہیئے۔

منکرینِ احادیث کے جوابات

یہ ثابت ہو چکا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول حجت ہے تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن کے خلاف ہو یعنی قرآن سے کسی چیز کا جواز نکلے اور نبی کے قول سے عدم جواز یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول قرآن سے زائد ہو یعنی قرآن میں اختصار ہو اور نبی کے قول میں تفصیل ہو یا قرآن میں مذکور ہی نہ ہو صرف نبی کے قول میں مذکور ہو تو ایسی صورت میں نبی کا قول حجت ہے یا نہیں۔؟

جواب: ہر صورت میں نبی کا قول حجت ہے۔ نبی کا قول مستقل حجت ہے۔ غیر مشروط حجت ہے۔ نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب تو حجت رہے اگر مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے یہ شرط غیر نبی کے لئے ہے کہ اگر غیر نبی کا قول قرآن کے مطابق ہے تو بے شک ہر غیر نبی کا قول بھی حجت ہے۔ اگر مطابق نہیں ہے تو ہر غیر نبی کا قول حجت نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح قرآن کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہماری عقل کے مطابق ہو تو حجت ہو اور ہماری عقل کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔ اسی طرح نبی کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تو حجت ہو اور قرآن کے مطابق نہ ہو تو حجت نہ ہو۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن کا حجت ہونا اس بنا پر ہے کہ وہ منجانب اللہ ہے۔ صرف منجانب اللہ ہونا قرآن کے حجت ہونے کی وجہ ہے۔ بالکل اسی طرح نبی من جانب اللہ ہے۔ کیونکہ اس کی تصدیق معجزہ کرتا ہے۔ اور معجزہ من جانب اللہ ہوتا ہے۔ لہذا نبی اور نبی کا قول بھی معجزہ کے بعد من جانب اللہ ہو گیا۔ اور من جانب اللہ ہونا ہی حجت ہے۔ لہذا نبی کا قول اور نبی مستقل حجت ہے۔

اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی اور قول نبی من جانب اللہ ہے۔ اور ہر وہ شے جو من جانب اللہ ہے قابلِ قبول اور حجتِ عمل ہے۔ لہذا نبی اور قولِ نبی حجتِ عمل ہے۔ نبی کا قول قولِ الٰہی ہے۔ اور من جانب اللہ ہے۔ اس آیت سے بھی ثابت ہے۔ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ" (یعتذرون۔ یونس) کہہ دے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی طرف سے تبدیل کر دوں میں تو صرف وحی کا پیرو ہوں۔ صاف ظاہر ہو گیا کہ نبی کا قول وحی ہے۔ قولِ الٰہی ہے من جانب اللہ ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ قرآن من جانب اللہ ہونے کی حیثیت سے حجت ہے نہ کہ قرآن اور کتاب ہونے کی حیثیت سے یہ ہے کہ متشابہات قرآن ہیں اور حجت نہیں ہیں۔ متشابہات پر عمل کرنے کو زیغ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ" (تلک الرسل۔ آل عمران) جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ متشابہات کی پیروی کرتے ہیں۔ غرضیکہ قرآن کا وہ حصہ جو متشابہات ہیں۔ باوجود قرآن ہونے کے حجت عمل نہیں ہے اور قرآن کا حجت ہونا صرف من جانب اللہ ہونے کی حیثیت سے ہے۔ لہذا علت حجت من اللہ ہونا ہے اور فرمایا وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ" (قال الم۔ طٰہٰ) قرآن کو جب تک اس کے متعلق پوری وحی تمہارے

پاس نہ آجائے جلدی نہ بیان کرو۔ یعنی خالی قرآن نازل ہوتے ہی مت بیان کرو۔ جب تک اس قرآن کے متعلق تمام وحی تم پر نازل نہ ہوجائے۔ یہ وہی وحی ہے جو غیر قرآن ہے۔ قرآن کی تفصیل اور اس کے متعلقات اس وحی کے ذریعے بتائے جاتے ہیں اور اس وحی میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ قرآن محکم ہے اور حجت ہے۔ اور یہ قرآن متشابہ ہے اور حجت نہیں ہے۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہوگیا کہ نبی من جانب اللہ ہے اور نبی کا قول من جانب اللہ ہے۔ لہٰذا یہ دونوں مستقل حجتیں ہیں۔ اب اگر کوئی کہے کہ متشابہ من جانب اللہ ہے اور من جانب اللہ ہونا بقول تمہارے قابلِ قبول اور حجتِ عمل ہے۔ تو چاہیئے کہ متشابہ بھی قابلِ قبول اور حجتِ عمل ہو۔ اس کا حل یہ ہے کہ متشابہ قابلِ قبول اور قابلِ ایمان ضرور ہے لیکن قابلِ عمل نہیں ہے۔ دوسری آیت نے متشابہات پر عمل کرنے کی ممانعت کردی ہے اور وہ یہ آیت ہے: فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ " (تلک الرسل - اٰل عمران) جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کتاب کے متشابہات پر عمل کرتے ہیں۔ اس آیت کی بنا پر متشابہات ناقابلِ عمل ہوگئے۔

رہی یہ بات کہ قول رسول قرآن کے خلاف ہو تو وہ بھی حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا نِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ " (سیقول - البقرۃ) تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیّت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے۔ جب کہ اسے موت آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ وارث کے لئے وصیت نہیں ہے۔ اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے یعنی وارث کے لئے وصیّت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ کردیا اور قول رسول قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا۔ اور اس حدیث کا موجب عمل اور حجت

ہونا تواتر سے ثابت ہے۔ نیز اکثر دینی مسائل کا ثبوت قرآن سے نہیں حدیث سے ہے۔ لہٰذا قولِ رسول حجت مستقلہ اور غیر مشروط حجت ہے۔ علیٰ ہٰذا اجماع بھی غیر مشروط حجت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُولِی الْاَمْرِ کا عطف رسول پر ہے۔ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ (والمحصنٰت۔ النسآء)

اب اگر کہا جائے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسول کا کوئی قول قرآن کے خلاف ہو اور رسول کا قول قرآن کو نسخ کردے تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ رسول کا قول اس کا اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔ جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسول کا قول بھی خدا کا قول ہے۔ اور جس طرح قرآن کی ایک آیت قرآن کی دوسری آیت کو منسوخ کردیتی ہے اسی طرح خدا کا ایک قول یعنی قولِ رسول دوسرے قول یعنی قرآن کو منسوخ کردیتا ہے۔ استعجاب کا باعث صرف یہ ہے کہ رسول کے قول کو رسول کا قول سمجھا جارہا ہے۔ رسول کے قول کو بشر کا قول سمجھا جارہا ہے۔ یاد رکھو رسول کا قول خدا ہی کا قول ہے۔" مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى " (قال فما - النجم) وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا اس کا بولنا صرف وہ وحی ہے جو اس پر کی گئی ہے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ نبی کا ہر قول وحی ہے اس کی وضاحت یوں بھی ہوسکتی ہے کہ نبی کا یا تو ہر قول وحی ہے یا کوئی قول وحی نہیں ہے۔ یا بعض قول وحی ہیں اور بعض قول وحی نہیں ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ نبی کا کوئی بھی قول وحی نہیں ہے تو شروع مسئلہ میں ہم نے اس خیال کو باطل کردیا ہے۔ اور یہ ثابت کردیا ہے کہ قرآن کے علاوہ نبی پر وحی ہوتی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ نبی کا کوئی قول وحی نہیں، قطعی غلط ہے۔ اب دوسری صورت نبی کے بعض قول وحی ہیں اور بعض قول وحی نہیں ہیں۔ تو یہ بھی باطل ہے۔ اس لئے کہ بعض اقوال کا وحی ہونا اور بعض کا وحی نہ ہونا تخصیص بلا مخصص ہے۔ یہ محال اور باطل ہے۔ بعض اقوال کا وحی ہونا آخر

کس قول سے معلوم ہوا۔ اگر نبی کے ایسے قول سے معلوم ہوا جو وحی ہے تو یہ قول انہی
بعض میں شامل ہے، اگر ایسے قول سے معلوم ہوا جو وحی نہیں ہے۔ تو نبی کا ایسا
قول جو وحی نہیں ہے، ایسے قول پر حجت ہوگیا جو وحی ہے۔ اور تم غیر وحی کو حجت
ہی نہیں مانتے۔ لہٰذا یہ شق بھی باطل ہوگئی۔ اور جب دونوں شقیں باطل ہوگئیں
یعنی نبی کا قول وحی نہیں ہے اور یہ بھی باطل ہوگیا کہ نبی کے بعض قول وحی ہیں اور بعض
قول وحی نہیں ہیں۔ تو لامحالہ یہ تیسری شق ثابت ہوگئی کہ نبی کا ہر قول وحی ہے اور جب
ہر قول وحی ہے تو نبی کا ہر قول حجت ہے اور قابل قبول ہے۔ بولو کیا کہتے ہو۔ جب
نبی نے پہلی بار کہا میں اللہ کا رسول ہوں میرا کہنا مانو اور ابھی کتاب نازل نہیں ہوئی
یا نازل ہوئی تو ایک دو آیتیں جس میں نبی کی پیروی کا ذکر نہیں ہے۔ اس وقت
اس کا قول ماننے کے قابل ہے یا نہیں؟ اگر کہو کہ ماننے کے قابل نہیں ہے تو قطعی
کافر ہوگئے۔ اور اگر کہو کہ ماننے کے قابل ہے تو قطعاً نبی کا قول مطلقاً حجت ہوگیا،
قطع نظر کتاب کے۔ اگر نبی کا قول بغیر کتاب کے حجت نہ تھا تو گویا فرعون کو بے حجت
عذاب دیا گیا۔ حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ
رَسُوْلًا" (سبحان الذی۔ بنی اسرآئیل) ہم جب تک رسول نہیں بھیج لیتے
اس وقت تک عذاب نہیں کرتے۔ یہ نہیں کہا کہ ہم جب تک کتاب نہیں بھیج لیتے اس
وقت تک عذاب نہیں کرتے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ نبی کا قول کتاب سے قطع نظر
کر کے حجت ہے۔

سوال: نبی کی طرف بے حیائی کی نسبت، جھوٹ کی نسبت غیر معقولیت
کی نسبت، ناواقفیت کی نسبت جن احادیث سے ظاہر ہو۔ اُن احادیث کو ان
نقائص کی بنا پر حدیث رسول سے خارج کر دینا چاہیئے یا نہیں جیسا کہ بعض احادیث
سے ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک

ظرف میں غسل کرتے تھے اور جیسا کہ بعض احادیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ
نے تین جھوٹ بولے اور جیسا کہ مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت
کے تھپڑ مارا اور جیسا کہ کھجور کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ زیادہ پھل آئے گا۔
اور زیادہ پھل نہیں آیا۔ ان احادیث سے بے حیائی، جھوٹ، نامعقولیت اور
ناواقفیت نبی کی طرف منسوب ہوتی ہے۔

جواب: محض ان نسبتوں سے حدیث ناقابل قبول نہیں ہوتی۔ مثلاً
بے حیائی کی جو نسبت کی گئی ہے وہ محض نسبت کرنے والے کا خیال ہے۔ میاں بیوی
کی برہنگی سے اگر بے حیائی مقصود ہو تو نظام نسل باطل ہوجائے گا۔ بے حیائی تو وہ
ہے جسے نبی بے حیائی بتائے۔ نبی نے کہیں میاں بیوی کے غسل کو بے حیائی نہیں بتایا
نہ کتاب اللہ نے اس فعل کو بے حیائی بتایا اور اگر اس قسم کی باتوں کو بے حیائی سے
تعبیر کیا جائے گا تو اللہ نے جو کواعب کا لفظ عورتوں کی تعریف میں فرمایا ہے۔ یہ
بے حیائی ہوگی۔ کواعب کاعب کی جمع ہے اور کاعب اس عورت کو کہتے ہیں جس
کے پستان ابھرے ہوئے ہوں اگر عورت کے پستان کی تعریف بے حیائی ہے تو اس
کو بھی قرآن سے خارج کر دینا چاہیئے اور اگر بے حیائی نہیں ہے تو عورت مرد یعنی
میاں بیوی کا باہم غسل بھی بے حیائی نہیں ہے۔

ابراہیم خلیل اللہ کی طرف جو جھوٹ کی نسبت ہے اس نسبت سے بھی حدیث
کو حدیث ہونے سے خارج نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر اس نسبت سے حدیث کو
خارج کیا جائے گا تو قرآن کو بھی خارج کیا جائے گا۔

فرمایا۔ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ" (وما ابرئ۔ یوسف)
یوسفؑ نے اپنے بھائی کے سامان میں پانی پینے کا برتن رکھ دیا اور پھر یہ کہوا دیا کہ تم
چور ہو۔ ظاہر میں یہ فعل جھوٹ سے بھی بدتر ہے۔ اور فرمایا۔ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ

(وما ابرئ - یوسف) ہم نے یوسف کو یہ تدبیر سکھائی۔ بہرحال قرآن میں یہ نقص نبی کی طرف منسوب ہے۔ تو چاہئے کہ اس آیت کو قرآن سے نکال دیا جائے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ملک الموت کے تھپڑ مارا۔ یہ بھی خلافِ عقل اور غیر معقول نہیں ہے کہ جب انسان کی فرشتہ سے ہمکلامی مان لی جو بظاہر غیر معقول ہے تو پھر ہاتھا پائی ماننے میں کیا غیر معقولیت ہے۔ دونوں ایک ہی درجہ کی باتیں ہیں۔ یعنی جو شخص کسی سے بات چیت کرسکتا ہے وہ اس کے تھپڑ بھی مار سکتا ہے۔ نیز اللہ نے فرمایا۔ "وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ط" (سیقول - البقرۃ) جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں ان کو مُردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم کو شعور نہیں۔ شہید کو زندہ کہنا عقل ہی کے خلاف نہیں بلکہ حس کے بھی خلاف ہے۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے ان کو زندہ کہا اور مزید تاکید کردی کہ تم بے حس ہو، بے شعور ہو۔ تم کو پتہ نہیں شہید کی زندگی قطعی عقل میں نہیں آتی۔ تو اگر حدیث کا خلاف عقل ہونا حدیث کو خارج کردیتا ہے۔ تو قرآن کا خلاف عقل ہونا قرآن کو خارج کردیتا ہے۔ یعنی جو اعتراض حدیث پر ہے بالکل وہی اعتراض قرآن پر ہے۔ اور جس طرح قرآن پر اعتراض قرآن کو قرآن ہونے سے خارج نہیں کرتا۔ اسی طرح حدیث پر اعتراض حدیث کو حدیث ہونے سے خارج نہیں کرتا اور کھجور کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا ویسا نہیں ہوا تو یہ بالکل قرآن کے مطابق ہے۔ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا (سبحان الذی الکھف) اور کسی کے کام کے بارے میں یہ نہ کہا کرو کہ کل اس کو کروں گا جیسا روح اور ذو القرنین اور اصحاب کہف کے سوال کے موقع پر حضور نے کہہ دیا تھا کہ کل جواب دے دوں گا اور پھر کل جواب نہیں دیا۔ اس آیت سے وہی بات ظاہر ہو رہی ہے جو حدیث سے ظاہر ہو رہی ہے۔ اور جس طرح یہاں یہ بات نبوت کے منافی نہیں ہے اسی طرح وہاں بھی نبوت کے منافی نہیں ہے۔ اس سارے بیان کا حاصل یہ ہے کہ حدیث پر جتنے اعتراضات ہیں اسی نوعیت کے اعتراضات قرآن پر وارد ہوتے ہیں۔ تو جس طرح قرآن کو قرآن ہونے سے ان اعتراضات کی بناء پر خارج نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ان اعتراضات کی بنا پر حدیث کو حدیث ہونے سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ تم کہتے ہو حدیث میں یہ بات ہے۔ اس بات کی وجہ سے ہم نہیں مانتے۔ ہم کہتے ہیں یہی بات قرآن کی آیت میں بھی ہے تو چاہئے کہ اس کو بھی نہ مانو اور یہ بیان تمام اعتراضات حدیث کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

حدیث کو اس وقت نہیں مانا جائے گا جب خبر واحد کو قبول کرنے کے شرائط مفقود ہو جائیں۔ قرآن کو اس وقت نہیں مانا جائے گا جب خبر متواتر کے شرائط مفقود ہو جائیں۔

خبر کے صحیح ہونے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ فی نفسہٖ مستحسن ہو۔ اچھی ہو۔ معقول ہو۔ بلکہ خبر کے صحیح ہونے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ جس کی طرف سے خبر دی جارہی ہے اس تک اسے ثابت کردیا جائے۔ خبر کی ذمہ داری قائل پر ہے جو شخص نقل کررہا ہے اس کی ذمہ داری صرف نقل کی صحت پر ہے۔ اور نقل کی صحت پر بارہ سو سالہ اجماع بالکل کافی اور وافی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک بات فی نفسہٖ حسن ہے اچھی ہے۔ واقعہ کے مطابق ہے۔ حق ہے لیکن جس شخص کی طرف سے اس کو نقل کیا جارہا ہے، درحقیقت اس کا قول نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک بات ہماری عقل میں معقول ہو اور قائل کا قول نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ ایک بات ہماری عقل میں نہ آئے اور وہ قائل کا قول ہو تو یہ کہنا کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہے اسے مانیں گے اور قرآن کے مطابق نہیں ہے اسے نہیں مانیں گے۔ غلط ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جو حدیث قرآن کے مطابق ہے وہ فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہو اور ہوسکتا ہے کہ جو

حدیث قرآن کے مطابق نہ ہو وہ قولِ رسول ہو۔

سوال: جب کہ یہ ثابت ہو چکا کہ قولِ رسول حجت ہے اور احادیث شرعاً حجت ہیں اور دین یا دین کا جزء ہیں تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح قرآن کو لکھوا کر قوم کو دے دیا اسی طرح احادیث کے مجموعہ کو بھی لکھوا کر دینا چاہیئے تھا۔ لکھوا کر کیوں نہیں دیا؟

جواب: احادیث کے مجموعہ کو اس لئے نہیں لکھوا کر دیا کہ احادیث کا مجموعہ وحی غیر کتاب ہے۔ کسی زمانے کے نبی نے وحی غیر کتاب کو لکھ کر نہیں دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی " وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ " (ومامن دابۃ۔ ھود) اور اس وحی کے متعلق تمام واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا " مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا " (ومامن دابۃ۔ ھود) تو اور تیری قوم اس سے پہلے ان واقعات کو نہیں جانتی تھی۔ نبی کی قوم سارا عالم ہے۔ اور جب کہ سارا عالم حضرت نوحؑ والی وحی سے ناواقف ہے تو ضرور بالضرور وہ وحیاں جو غیر کتاب تھیں وہ لکھی نہیں گئیں۔ اگر لکھی جاتیں تو یہود یا نصاریٰ کوئی نہ کوئی قوم ان لکھی ہوئی وحیوں پر مطلع ہوتی۔ اس کے بعد میں کہتا ہوں کہ احادیث میں زیادہ تر اعمال کا ذکر ہے۔ اعمال ایسی چیز ہیں کہ وہ پڑھنے پڑھانے سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔ اعمال تو کرنے کی چیز ہیں۔ اس لئے عمل کو نہیں لکھوایا بلکہ عمل کی پریکٹس (مشق) کرادی۔ عمل کو یاد کرانا یا پڑھوانا لکھوانا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ عمل کو تو کرانا مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے حدیث پر عمل کرایا اور اس کی مشق کرادی۔ فرمایا۔ صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي۔ جس طرح میں نماز پڑھتا ہوں اسی طرح تم بھی نماز پڑھو۔ یعنی عمل کی مشق کرائی۔ یہ نہیں کہا کہ صرف اس حدیث کو یاد کرکے لکھو لیکن بعد میں زمانہ ایسا آیا کہ بدعملی بڑھی تو نصیحت کی باتیں جن لوگوں کو یاد تھیں انہوں نے لکھ لیں

تاکہ نصائح مفقود نہ ہو جائیں۔ اور قرآن میں قصص اولین اور جملہ عقائد ہیں وہ یاد نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لئے ان کو لکھنے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو لکھوا کر دیا تو یہ لکھ کر دینے کا حکم کہیں قرآن میں نہیں ہے جہاں ہے اُتْلُ مَا أُوحِيَ پڑھ جو وحی کی گئی وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ۔ جب قرآن پڑھا جائے تو سنو۔ کہیں یہ نہیں کہ قرآن کو لکھو۔ پھر جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو لکھوا کر دیا یہ کس وجہ سے دیا۔ یا تو وحی کے ذریعہ ان کو حکم ہوا کہ قرآن لکھوادو۔ اگر ایسا ہے تو وحی غیر قرآن اور وحی غیر متلو ثابت ہو گئی۔ اور اگر بغیر وحی کے کیا تو ان کی رائے حجت ہو گئی۔ لہذا ان کی رائے سے قرآن لکھا گیا اور ان ہی کی رائے سے حدیث نہیں لکھی گئی۔ دونوں جگہ ایک ہی چیز کار فرما ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ وحی ہوئی کہ قرآن لکھوادو اسی طرح یہ وحی ہوئی کہ حدیث نہ لکھواؤ۔ اور اگر ذاتی رائے یہ ہوئی کہ قرآن لکھواؤ تو بے شک ذاتی رائے یہی ہوئی کہ حدیث نہ لکھواؤ۔

سوال: اللہ تعالےٰ نے فرمایا إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (ربما۔ الحجر) ہم نے نصیحت نازل کی اور ہم ہی اس کے نگہبان اور محافظ ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن محفوظ ہے اور حدیث محفوظ نہیں ہے۔ تو اللہ تعالےٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے بس وہی چیز دین ہے اور وہ چیز محفوظ ہے اور حدیث چونکہ محفوظ نہیں ہے اس لئے نہ خدا اس کا محافظ ہے نہ ذکر ہے نہ دین۔

جواب: اللہ تعالےٰ نے ذکر یعنی نصیحت کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے اور اس کا وعدہ سچا ہے وہ ذکر اور نصیحت کا محافظ ہے اور ذکر اور نصیحت قرآن اور حدیث دونوں میں ہے۔ لہذا دونوں محفوظ ہیں۔ قرآن بھی محفوظ ہے اور حدیث بھی محفوظ ہے بلکہ قرآن کے حافظ تو ایک فیصدی مشکل سے ملیں گے اور حدیث کے معانی کے حافظ

ساری قوم ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مسواک سنت ہے۔ عید کے دن روزہ حرام ہے۔ زنا کی سزا رجم ہے۔ صبح کی نماز کی دو سنتیں ہیں۔ ظہر کی چھ سنتیں ہیں۔ قبر میں نکیرین سے سوال جواب ہوگا۔ عذاب قبر ثواب قبر حق ہے۔ غرضیکہ معاملات اور عبادات کے جو طریقے حدیث نے بتائے ہیں۔ وہ ہر جاہل اور عالم کے حافظہ میں محفوظ ہیں۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس نے دین کو محفوظ کر دیا ہے۔ ہر شخص حافظ سنت ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ حدیث غیر محفوظ ہے بالکل غلط ہے۔ حدیث عملاً محفوظ ہے۔ قرآن تلاوتاً محفوظ ہے۔

منکرِ حدیث کے ترجمہ کی غلطی

سوال: منکرین حدیث نے اللہ تعالیٰ کے اس قول یعنی مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ (تلک الرسل۔ ال عمران) کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اللہ اس کو کتاب اور حکومت اور نبوت دے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میری محکومی اختیار کرو۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم سب ربانی بن جاؤ۔ سوال یہ ہے کہ یہ معنی صحیح ہیں یا غلط ہیں؟

جواب: یہ معنی غلط ہیں۔ یعنی حکم کے معنی حکومت کے اور کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ کے معنی میری محکومی اختیار کرو کے غلط ہیں۔

مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہاں حکم کے معنی فہم کے ہیں۔ اور نیز اگر حکم کے معنی حکومت کے ہوں گے تو آیت وَاٰتَیْنٰهُ الْحُکْمَ صَبِیًّا (قال الم۔ مریم) میں حکم کے معنی اگر حکومت کے ہوں گے تو آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے یحییٰ کو بچپن میں حکومت دی تھی اور یہ بالکل غلط ہے۔ اور جن بندوں کو حکم اور نبوت ملی ہے ان میں اکثر صاحبِ حکم اور نبوت کو حکومت نہیں ملی۔ اگر حکم کے معنی حکومت کے ہوں تو ہر وہ شخص جس کو حکم و نبوت ملے وہ صاحبِ حکومت ہو حالانکہ بیشتر انبیاء صاحبِ حکومت نہ تھے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر نبی صاحبِ حکم ہے اور صاحبِ حکومت نہیں ہے۔ اب اگر حکم اور حکومت ایک ہی چیز ہو تو ہر نبی صاحبِ حکومت ہو حالانکہ ہر نبی صاحبِ حکومت نہیں ہے، کیونکہ اکثر انبیاء کو تکلیفیں دی گئیں اور قتل بھی کئے گئے۔ اگر صاحبِ حکومت ہوتے تو تکلیف زدہ نہ ہوتے اور نہ مقتول ہوتے

لہذا یہاں حکم کے معنی حکومت کے نہیں ہیں۔

دوسری غلطی اس ترجمہ میں یہ ہے کہ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ کے معنی میری محکومی اختیار کرو کے نہیں ہیں بلکہ معنی یہ ہیں کہ میرے بندے ہو جاؤ۔ عباد کے معنی بندے کے ہیں، عباد کے معنی محکومی کے نہیں ہیں۔ اس لئے کہ عباد کا لفظ جس طرح انسانوں کے لئے آیا ہے اسی طرح قرآن شریف میں غیر انسانوں کے لئے بھی آیا ہے جیسے "اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔" (قال الملا۔ الاعراف) بیشک اللہ کو چھوڑ کر جن کو تم پکارتے ہو وہ تم ہی جیسے بندے ہیں۔ یہاں بتوں کو اللہ تعالیٰ نے عباد سے تعبیر کیا ہے۔ فرشتوں کے متعلق فرمایا "بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (اقترب۔ الانبیاء) بلکہ وہ معزز بندے ہیں اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْٓ اَوْلِیَآءَ (قال الم۔ الکہف)

کیا پھر بھی کافر اس خیال میں ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا حمایتی بنائیں اور جن بندوں کو ان کافروں نے حمایتی اور اولیا اپنا بنایا ہے۔ وہ بت ہیں، شمس و کواکب ہیں، جن ہیں، ملائکہ ہیں۔ مسیح علیہ السلام ہیں۔ غرضیکہ عباد کا لفظ مخلوق کے لئے مستعمل ہے اور جگہ جگہ قرآن میں عباد کا لفظ مخلوق ہی کے معنی میں آیا ہے۔ محکوم کے معنی میں نہیں آیا، اور ظاہر ہے کہ مخلوق کی ان مشرکوں نے عبادت تو کی ہے مگر محکومی اور اطاعت نہیں کی ہے اس لئے کہ نہ ملائکہ نے نہ جنوں نے نہ شمس و کواکب نے نہ مسیح نے نہ بتوں نے ان کو حکم دیا کہ ہماری عبادت کرو۔ یعنی یہ بغیر ان کے حکم کے ان کی عبادت کر رہے ہیں تو یہ مشرک ان کی عبادت تو کر رہے ہیں مگر ان کی اطاعت اور محکومی نہیں کر رہے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ عبادت اور چیز ہے، اطاعت اور محکومی اور چیز ہے تو یہ معبودانِ باطل معبود تو ہیں لیکن مطاع اور حاکم نہیں ہیں۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اصنام اور جن وغیرہ معبود ہیں اور اصنام و جن وغیرہ مطاع نہیں ہیں۔ نتیجہ صاف برآمد ہوا کہ معبود مطاع نہیں ہے اور جب معبود مطاع نہیں ہے تو عبادت اطاعت نہیں رہی اور جب عبادت و اطاعت نہیں تو عباد مطیع، فرمانبردار، محکوم نہ ہوئے تو کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ کے یہ معنی کہ میرے فرمانبردار مطیع، محکوم ہو جاؤ غلط ہوئے اور یہی ہم کو ثابت کرنا تھا۔

اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ نبی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تمہارا خالق ہوں تم میری مخلوق ہو میں تمہارا معبود ہوں، تم میرے عابد ہو اور میری پوجا کرو اور میری پرستش کرو بلکہ وہ یہ کہے گا کہ رب پرست ہو جاؤ، ربّانی ہو جاؤ میں کہتا ہوں کہ اطاعت کے معنی امتثالِ امر کے ہیں یعنی حکم کی تعمیل اور امر و حکم کے مطابق کام کرنا تو اطاعت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اطاعت کرانے والا امر کرنے والا ہو، اور ان معبودانِ باطل نے کوئی حکم نہیں دیا۔ کوئی امر نہیں کیا تاکہ ان کے حکم کی تعمیل انکی اطاعت سمجھی جاتی۔ لہٰذا یہاں اطاعت قطعاً متحقق نہیں ہے اور عبادت قطعاً متحقق ہے تو معلوم ہو گیا کہ عبادت اطاعت نہیں ہے، عبادت حکم نہیں ہے تاکہ عباد اور عابدین مطیع اور محکوم کہلائے غور کرو۔

سوال:۔ منکرینِ حدیث نے اپنے رسالہ اطاعتِ رسول میں کہا ہے کہ اطاعت صرف اللہ کی ہے۔ یہ صحیح ہے یا غلط؟

جواب:۔ غلط ہو بلکہ صحیح یہ ہے کہ اطاعت صرف اللہ کی ہے حتیٰ کہ ایمان بھی غیر اللہ یعنی انبیاء اور رسل اور ملائکہ پر لانا فرض ہے لیکن عبادت انبیاء و ملائکہ اور رسل کی حرام ہے۔ عبادت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے اور اطاعت اللہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ جس طرح ایمان اللہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ فرمایا۔ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ (واذا سمعوا المائدہ) مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ (تلک الرسل۔ آل عمران) اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ اطاعت میں اشتراک اور ایمان میں اشتراک واجب ہے۔ عبادت میں اشتراک حرام ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ایمان بھی عبادت سے الگ چیز ہے اور اطاعت بھی عبادت سے الگ چیز ہے۔

رسالہ "طلوعِ اسلام" جون ۱۹۵۷ء کے

باب المراسلات کے جوابات

سوال:۔ طلوع اسلام بابت ماہ جون ۱۹۵۷ء میں چھپا ہے کہ ہر نبی صاحبِ کتاب تھا یہ صحیح ہے یا غلط؟

جواب: یہ بالکل غلط ہے ہر نبی صاحب کتاب نہیں تھا۔ اگر ہر نبی صاحبِ کتاب ہوتا تو موسیٰؑ و ہارونؑ کو دو کتابیں ملتیں حالانکہ دونوں کو ایک ہی کتاب ملی تھی۔ اور وہ توراۃ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ (ومالی۔ الصّٰفّٰت) ہم نے ان دونوں کو (یعنی موسیٰؑ و ہارونؑ کو) روشن کتاب دی اس کے علاوہ فرمایا۔ إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا (لا یحب اللہ۔ المائدۃ) ہم نے توریت اتاری اس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ اسی توریت سے متعدد انبیاء (جو اپنے رب کے مطیع تھے) یہودیوں کو حکم دیا کرتے تھے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ متعدد انبیاء ایک ہی کتاب کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے اور احکام نافذ کرتے تھے۔ اب اگر ہر نبی صاحبِ کتاب ہوتا تو یہ متعدد انبیاء یہود کو اپنی اپنی کتاب کے ذریعہ سے حکم دیتے۔ حالانکہ یہ انبیاء توریت کے مطابق حکم دیتے تھے۔ جو ان انبیاء پر قطعاً نازل ہی نہیں ہوئی تھی آپ لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اس بحث کا مقصد کیا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ توراۃ کے علاوہ حضرت موسیٰؑ پر وحی ہوئی۔ انجیل کے علاوہ حضرت عیسیٰؑ پر وحی ہوئی قرآن مجید کے علاوہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی ہوئی۔ دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُوا بَقَرَةً (آلمٓ البقرۃ) اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کرو۔ اس آیت سے لے کر فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا تک پانچ قول اللہ کے ہیں۔ اگر یہ اقوال الٰہی توریت میں مذکور ہوتے تو سوال وجواب کی نوبت نہ آتی۔ توریت میں قوم دیکھ لیتی اور گھڑی گھڑی سوال وجواب نہ کرتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ قَالَ اللَّهُ إِنِّي مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَن يَكْفُرْ بَعْدُ مِنكُمْ فَإِنِّي أُعَذِّبُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ (واذا سمعوا۔ المائدۃ) اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تم پر خوان نازل کروں گا۔ پھر اسکے بعد تم میں سے جس نے کفر کیا اسکو ایسی سخت سزا دوں گا کہ تمام عالم میں سے کسی کو اتنی سخت سزا نہیں دی ہوگی۔

اب اگر انجیل میں یہ اللہ کا قول ہوتا تو حواری یہ نہ کہتے کہ کیا تیرا رب آسمان سے ہم پر خوان اتار سکتا ہے:۔ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَن يُنَزِّلَ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَاءِ (واذا سمعوا۔ المائدۃ) اور حضرت عیسیٰؑ یہ نہ فرماتے کہ اللہ سے ڈرو۔ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ (واذا سمعوا۔ المائدۃ) بالکل اسی طرح ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل ہوا اور اس کے علاوہ وحی نازل ہوئی۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ شریف میں تشریف رکھتے تھے۔ اس وقت تک کعبہ کی طرف سجدہ کرتے رہے۔ حالانکہ اس زمانے کے متعلق قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ کعبہ کی طرف سجدہ کرو۔ علیٰ ہذا قرآن کی تنزیلی ترتیب کی تبدیلی اور تعداد ازدواج بغیر وحی محال ہے تفصیلات گذشتہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں۔

سوال: جب یہ ثابت ہوگیا کہ ہر نبی صاحب کتاب نہیں ہے تو پھر اس

آیت کی کیا توجیہ ہے۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ (سیقول۔ البقرۃ) اللہ نے انبیاء کو خوشخبری دینے کے لئے اور ڈرانے کے لئے بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی۔

جواب: پوری آیت یہ ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ۔" دنیا میں لوگوں کی ایک ہی جماعت تھی۔ یعنی دو گروہ نہ تھے۔ پھر اللہ نے انبیاء ڈرانے اور خوشخبری دینے کو بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی۔ یہاں لفظ کتاب کا ہے۔ کتابوں کا نہیں ہے۔" اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی۔" کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کتاب نازل کی۔ یعنی معھم کے معنی مَعَ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ نہیں ہیں۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کہ" وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔" (سبحان الذی۔ بنی اسراءیل) ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور ان کو خشکی و تری میں سواری دی اور ان کو پاکیزہ روزی دی اور ان کو اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

" ان کو خشکی اور تری میں سواری دی " کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو سواری دی۔ اسی طرح پاکیزہ روزی ان میں سے ہر ایک کو نہیں دی گئی۔ نیز ان میں سے ہر ایک کو اکثر مخلوق پر فضیلت نہیں دی گئی۔ کیونکہ ان میں سے کافر کے لئے فرمایا۔ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (عم۔ البینہ) " یہ کافر بدترین خلائق ہیں۔" کسی مخلوق سے افضل نہیں ہیں۔ بالکل اسی طرح " ان کے ساتھ کتاب نازل کی " کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کتاب نازل کی۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جتنے نبی ہوتے اتنی ہی کتابیں ہوتیں۔ اور اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ موسیٰؑ اور ہارون علیہما السلام دونوں کو ایک ہی کتاب ملی تھی۔ بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ان انبیاء میں سے کسی ایک جماعت یا فرد کے ساتھ کتاب نازل کی اور یہ طریقۂ تکلم ہر زبان میں ہوتا ہے۔ مثلاً فوج کے ساتھ توپ خانہ بھیجدیا۔ برات کے ساتھ جہیز بھیجدیا۔ فلاں پارٹی کے ساتھ کھانا بھیجدیا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر فوجی ہر براتی یا ہر فرد کے ساتھ توپ خانہ یا جہیز یا کھانا بھیجدیا۔ بالکل اسی طرح انبیاء کے ساتھ کتاب بھیجنے کے یہی معنی ہیں کہ ان میں سے کسی ایک جماعت یا ایک فرد کے ساتھ کتاب بھیجدی۔ اور اس معنی پر لفظ کتاب کا واحد لانا دلالت کر رہا ہے اگر کتاب کی جگہ کتب کا لفظ ہوتا تو ممکن تھا کہ ہر ہر واحد کے ساتھ کتاب ہوتی۔

سوال: منکر حدیث نے صفحہ ۵۸ پر لکھا ہے کہ غلام احمد قادیانی نے اس خیال کو پھیلایا تھا کہ نبی بے کتاب کے بھی ہوتا ہے۔

جواب: مسلمانوں کا بالاجماع اور باتفاق یہ عقیدہ ہے کہ نبی صاحبِ کتاب بھی ہوتا ہے اور بے کتاب بھی۔ اسی عام عقیدے کے پیشِ نظر قادیانی نے دعویٰ کیا۔ اگر یہ عام عقیدہ نہ ہوتا تو دعویٰ کرتے ہی لوگ اس کی فوراً تکذیب کرتے اور اس کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ قادیانی نے اس خیال کی تعمیم نہیں کی۔ بلکہ اس سے قبل تمام مسلمانوں میں یہی عقیدہ تھا۔ یعنی نبی بے کتاب کے بھی آیا کرتا تھا۔

سوال: صفحہ ۵۸ پر کہا ہے جو وحی کتاب کے علاوہ تھی وہ وحی کتاب کی طرح کیوں نہیں محفوظ رکھی گئی۔

جواب: محفوظ رکھنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک لکھنا، دوسرے مشق کرانا۔ چونکہ وحی غیر کتاب میں اعمال کی تفصیل تھی اس لئے ان کو لکھوایا نہیں بلکہ ان کی مشق کرا دی۔ کیونکہ اعمال کا لکھنا اتنا مقصود نہیں ہے جتنا ان کا کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتا ہوا دیکھو۔ اسے صرف لکھ کر دے جاتے تو نماز کی مشق نہیں ہو سکتی تھی۔ ہر شخص کو روزے نماز اور اکثر ضروری اعمال

کی مشق ہو گئی اس لئے وحی غیر کتاب عملاً محفوظ ہے۔ اور اللہ کا وعدہ سچا ہے جو اس نے کہا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ ہم ہی نے نصیحت اور ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ تو جس طرح سے قرآن تلاوتاً محفوظ ہے۔ اسی طرح سے وحی غیر کتاب یعنی حدیث عملاً محفوظ ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ صبح کے فرضوں سے قبل دو سنتیں ہیں۔ مغرب کے بعد دو ہیں۔ ظہر سے پہلے پیچھے چھ سنتیں ہیں۔ عشاء کے بعد دو سنتیں اور تین وتر ہیں۔ مسواک سنت ہے۔ نکیرین کا سوال جواب حق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرضکہ وحی غیر کتاب کے مضامین عملی طور پر اب تک محفوظ ہیں۔ قرآن کے حافظ تو ایک فیصدی بھی نہیں ملیں گے۔ لیکن حدیث کو عملاً محفوظ رکھنے والے حفاظ قرآن سے بہت زیادہ ہیں۔ اس کے علاوہ وحی غیر کتاب کو نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وحی غیر کتاب انبیاء سابقین میں نہیں لکھی جاتی تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے۔ " وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ (ومامن دابۃ۔ ھود) نوح پر یہ وحی ہوئی کہ اب تیری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ جو لانے تھے وہ لا چکے یہ وحی غیر کتاب ہے۔ کیونکہ کتاب اصلاحِ قوم کے لئے ہوتی ہے اور یہ وقت اصلاح کا نہیں یا یوسی کا ہے۔ اب کوئی ایمان نہیں لا سکتا ایسی صورت میں ایمان اور نیک عمل کے لئے کتاب بھیجنا بے سود تھا لہذا یہ وحی غیر کتاب ہے۔ اور اس آیت کے بعد اور بھی وحی ہوئی اور آخر میں کہا کہ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۔ (ومامن دابۃ۔ ھود) اس سے پہلے نہ تو جانتا تھا ان خبروں کو نہ تیری قوم جانتی تھی اور نبی چونکہ سارے عالم کی طرف بھیجا گیا ہے۔ اس وقت نبی اور سارا جہان ان وحیوں سے بے خبر تھا اور اس سے قبل بھی سب لوگ بے خبر تھے۔ اگر یہ وحی لکھی ہوئی ہوتی تو اس سے قبل کوئی نہ کوئی قوم باخبر ہوتی۔ اس سے پتہ چل گیا کہ متقدمین انبیاء کا دستور نہ تھا کہ وہ وحی غیر کتاب کو لکھواتے اس کے علاوہ ہم پوچھتے ہیں کہ قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کس وجہ سے لکھوایا۔؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا وحی ہوئی تھی کہ قرآن کو لکھوا دو۔ یا انہوں نے اپنی رائے سے لکھوایا؟ بس یہی دو صورتیں ہیں کہ یا وحی سے لکھوایا یا اپنی رائے سے لکھوایا۔ قرآن میں کسی جگہ بھی یہ حکم نہیں ہے کہ قرآن کو لکھو جہاں ہے یہی ہے کہ پڑھو سنو۔ کہیں یہ نہیں ہے کہ لکھو۔ لہذا اگر وحی سے لکھوایا تو یہ وہی وحی ہے جو غیر قرآن ہے۔ قرآن کے لکھوانے کی وحی ہوئی قرآن کو لکھوا دیا۔ حدیث کے لکھنے کی وحی نہیں ہوئی۔ حدیث کو نہیں لکھوایا۔ اور اگر اپنی رائے اور مرضی سے قرآن کو لکھوایا تو بے شک اپنی رائے اور اپنی مرضی سے حدیث کو نہیں لکھوایا۔ دونوں جگہ رائے کا فرما ہے۔ (اس کی تفصیل پچھلے صفحات میں موجود ہے) نیز ممکن ہے کہ قرآن کو اس وجہ سے لکھوایا ہو کہ اس کے الفاظ کے ساتھ معجزہ متعلق تھا۔ اور چونکہ وہ دعویٰ دائم ہے لہذا دلیل اور معجزہ بھی دائم ہونا چاہئے۔ حدیث کے الفاظ کے ساتھ معجزہ متعلق نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کو نہیں لکھوایا۔

سوال: صفحہ ۵۸ پر منکر حدیث نے کہا کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بولتے تھے وہ سب وحی ہوتا تھا بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ بولنا وحی تھا اور کچھ بولنا وحی نہیں تھا۔ منکر حدیث نے اس آیت سے ثابت کیا ہے۔ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ (ومن یقنت۔ سبا) ان سے کہہ دو کہ میں اگر غلطی کرتا ہوں تو یہ غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے (یا اس کا وبال میرے اوپر پڑتا ہے) اور اگر میں سیدھے راستے پر ہوتا ہوں تو یہ اس وحی کی بناء پر ہوتا ہے جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کہنا کہ نبی کا کچھ نطق وحی ہے اور کچھ وحی نہیں ہے اور اس پر اس آیت سے استدلال صحیح ہے یا نہیں۔؟

جواب: یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ اور یہ ترجمہ بھی غلط ہے ترجمہ صحیح

یہ ہے۔" ان سے کہہ دو کہ اگر میں غلطی کروں اور گمراہ رہوں تو اس غلطی کرنے اور گمراہ ہونے کی صورت میں اس غلطی اور گمراہی کا ضرر میری ہی جان پر پڑے گا۔" غلطی کرنے اور گمراہ ہونے کی تقدیر پر یہ کہوایا جا رہا ہے۔ حضور واقعی غلطی تو نہیں کرتے تھے اور گمراہ نہیں ہوتے تھے۔ "تقدیر" کے معنی یہ ہیں کہ فرض کرو میں گمراہ ہو جاؤں تو اس صورت میں میری گمراہی کا ضرر میری ہی جان پر پڑے گا۔ یہاں "اِن" کا لفظ ہے جو تقدیر اور فرض کے لئے ہے۔ تحقیق نہیں ہے۔ یعنی گمراہی مفروض اور فرضی اور تقدیری ہے نہ کہ تحقیقی جیسے " فَاِنۡ کُنۡتَ فِیۡ شَکٍّ " اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تو شک میں واقعی ہے۔ بالکل اسی طرح " اِنۡ ضَلَلۡتُ " کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں واقعتاً گمراہی میں ہوں بلکہ معنی یہ ہیں کہ بفرضِ محال اگر میں گمراہی میں ہوں تو اس تقدیر پر میری گمراہی کا وبال میری جان پر پڑے گا۔ لہٰذا اس آیت کا یہ مطلب لینا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کا کوئی حصّہ گمراہی کا بھی تھا کفر صریح ہے۔ اور اس کی مثال سورۂ مومن میں ہے۔" اِنۡ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیۡہِ کَذِبُہٗ " اگر موسیٰ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر پڑے گا۔ وَاِنۡ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبۡکُمۡ بَعۡضُ الَّذِیۡ یَعِدُکُمۡ اور اگر وہ سچا ہے تو جس عذاب کا اس نے وعدہ کیا ہے وہ کچھ نہ کچھ تم کو پہنچ کر رہے گا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ موسیٰؑ معاذ اللہ کچھ جھوٹا ہے اور کچھ سچا ہے۔ بالکل اسی طرح " اِنۡ ضَلَلۡتُ فَاِنَّمَاۤ اَضِلُّ عَلٰی نَفۡسِیۡ وَاِنِ اہۡتَدَیۡتُ فَبِمَا یُوۡحِیۡۤ اِلَیَّ رَبِّیۡ " ہے۔ جس طرح وہاں تقسیم صدق و کذب میں نہیں ہے اسی طرح یہاں ہدایت وضلالت میں تقسیم نہیں ہے تو یہ ترجمہ کرنا کہ اگر میں غلطی کرتا ہوں تو یہ غلطی میری اپنی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اور اس سے یہ معنی نکالنے کہ نبی غلطی کرتا ہے تو اپنی طرف سے کرتا ہے اور سیدھے رستہ پر چلتا ہے تو وحی سے چلتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے، کفر ہے، جہالت ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے جو کچھ میں کہتا ہوں اگر یہ میری اپنی طرف سے ہے تو اس کا وبال مجھ پر ہے اور اگر یہ میری اپنی طرف سے

نہیں ہے (اور قطعاً میری اپنی طرف سے نہیں ہے) تو پھر قطعاً یہ میرے رب کی وحی سے ہے۔ یہ ہے مطلب اس آیت کا نہ یہ کہ کچھ میری اپنی طرف سے ہے اور کچھ وحی سے ہے۔ اب ہم کہتے ہیں۔ بولو کیا کہتے ہو تمہارے کہنے کے مطابق نبی اپنی وجہ سے غلطی کرتا ہے۔ آیا تمہارے نزدیک نبی نے غلطی اپنی طرف سے اپنی وجہ سے کی یا نہیں کی اگر کی تو قطعی اس آیت کی رُو سے نبی پر اس غلطی کا وبال ہے اور ایسا کہنا قطعی کفر ہے۔ اور اگر نبی نے اپنی وجہ سے غلطی نہیں کی تو سارا کا سارا معاملہ تمام اقوال و افعال نبی کے بالوحی ہیں اور یہی ہم کو ثابت کرنا ہے۔ اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ سورۃ النجم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمۡ وَمَا غَوٰی " تمہارا سردار نہ گمراہ ہے نہ کج راہ ہے۔ اب اس آیت یعنی اِنۡ ضَلَلۡتُ فَاِنَّمَاۤ اَضِلُّ کے کیا معنی ہوئے جبکہ صاف طور پر قرآن نے کہہ دیا کہ تمہارا سردار ضال نہیں ہے پھر نبی اپنی وجہ سے یا اپنی طرف سے کون سی ضلالت کرتا ہے۔ لہٰذا اگر نبی ضلالت کرے گا تو تمام نظامِ شریعت باطل ہو جائے گا۔ اور مسلمان کے منہ سے نعوذ باللہ یہ کلمہ کیونکر نکل سکتا ہے کہ نبی ضلالت کرتا ہے۔ نبی کے متعلق فرمایا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ سیدھے رستے پر ہے۔

بس مطلب یہ ہے جو کچھ بھی میں کہتا ہوں اگر یہ میری اپنی طرف سے ہے تو قطعاً اُس کا وبال میری جان پر ہے۔ یعنی وبال معلّق ہے میری اپنی طرف سے کہنے پر۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی کہے کہ اگر زید پتھر ہو گا تو وہ بے جان ہو گا اور زید کا پتھر ہونا محال ہے۔ اس شرطِ محال پر جزا مرتّب ہے۔ اسی طرح یہ بات ہے کہ اگر میں غلطی کرتا ہوں یعنی میرا غلطی کرنا محال ہے۔ کیونکہ یہ محال وبال جان ہے اور میرے اوپر کوئی وبال نہیں ہے لہٰذا میرا غلطی کرنا محال ہے۔ ایسی غلطی وہ لوگ کیا کرتے ہیں جو ابتدائی قوانین علم سے بھی بے خبر ہوتے ہیں۔ لہٰذا آیت شریفہ کے یہ معنی ہوئے جو کچھ بھی میں کہتا ہوں اگر یہ میری اپنی طرف سے ہے اور میں نے غلط طریقے پر اس کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے تو بیشک

اس کا وبال میری جان پر ہے۔ اور اگر جو کچھ میں کہتا ہوں میری اپنی طرف سے نہیں ہے تو یہ قطعًا اللہ کی وحی سے ہے۔ غور کرو۔

سوال: (صفحہ ۵۹) اسی مقام پر منکرِ حدیث نے کہا ہے کہ اس حقیقت کی تشریح میں قرآن میں کئی واقعات ایسے مذکور ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے حضور سے کہا ہے کہ آپ نے ایسا کیوں کہا۔ مثلاً سورۂ توبہ میں ہے "عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ" اللہ تجھے معاف کرے۔ تو نے انہیں کیوں اجازت دی۔

اب سوال یہ ہے کہ حضور کی جب ہر بات وحی سے تھی تو پھر یہ تادیب کیسی؟ یعنی پہلے خود ہی وحی کی اور پھر پوچھا ایسا کیوں کیا۔؟

جواب: اللہ تعالیٰ کو ہر وقت حق ہے جو چاہے کہے اور جو چاہے کرے اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے تثلیث کی تبلیغ نہیں کی اور پھر ان سے پوچھا کہ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو بھی اللہ کے علاوہ معبود قرار دو۔ اللہ کو خوب معلوم تھا کہ انہوں نے یہ بات ہرگز نہیں کہی پھر بھی اللہ نے ان سے پوچھا۔ اللہ تعالےٰ نے اعلان کر دیا۔ "اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ" (ومن یقنت۔ یٰس) بے شک تو رسولوں میں سے ہے۔ سیدھے رستے پر ہے۔ اللہ نے اعلان کیا مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى " تمہارا صاحب نہ گمراہ ہے نہ کج راہ ہے۔

ان دونوں آیتوں سے ظاہر ہو گیا کہ نبی نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اس کے باوجود اللہ تعالےٰ فرمایا۔ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (حٰم۔ الفتح) تاکہ تیرے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دے۔ اللہ کو حق ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ اس نے تیرے گناہ معاف کر دیئے حالانکہ اللہ نے خود اوپر کی آیتوں میں نبی کی بے گناہی بیان کر دی۔ اللہ نے فرمایا وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ۔ (قال الملا الانفال) سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ یعنی اس

کے دل تک ایمان کو آنے نہیں دیتا اور پھر خود کہتا ہے۔ اَيْنَ تَذْهَبُوْنَ کہاں چلے جاتے ہو۔ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ کیوں کفر کر رہے ہو۔ خود ہی ان کے دل تک ایمان کو پہنچنے نہیں دیتا اور خود ہی کہتا ہے۔ مَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا ان کا کیا جاتا جو ایمان لے آتے۔ خود کہتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ۔ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور پھر کہتا ہے اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ۔ "فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ" کہاں پھرے جاتے ہو۔ کہاں بہکے جلتے ہو۔ خود کہتا ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ان کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ اور پھر خود کہتا ہے فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ان کو کیا ہو گیا جو ایمان نہیں لاتے۔ خود کہتا ہے وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا ہم نے ان کے آگے اور پیچھے روک لگا دی ہے۔ اور پھر خود کہتا ہے مَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا۔ لوگوں کو ایمان لانے سے کس نے روکا خود کہا اِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ ہم نے تیرے بعد میں تیری قوم کو یعنی موسٰی کی قوم کو بہکا دیا۔ خود کہتا ہے ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ خود کہا فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ بخدا وہ مسلمان ہی نہیں شمار کئے جائیں گے جب تک وہ تم کو حکم نہ بنائیں گے۔ یہاں نبی کو حکم بنا دیا۔ خود کہتا ہے لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ تو نے کیوں اجازت دے دی۔

براہینِ قاہرہ عقلیہ سے ثابت ہو گیا کہ بندہ کے ہر فعل کا خالق خدا ہی ہے اور نص سے بھی وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ اللہ تمہارا اور تمہارے اعمال کا خالق ہے۔ اس کے باوجود بندے کو بُرا کہہ رہا ہے کہ تم نے یہ کیوں کیا۔ غرضیکہ بے شمار آیات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بندہ کے ہر عمل کا خالق خدا ہی ہے اور بے شمار آیات ایسی ہیں جن میں بندہ سے کہتا ہے۔ تو نے یہ کیوں کیا۔ اب اور دیکھئے فرماتا ہے: سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ اے جن وانس ہم تم سے سلٹنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ اس آیت میں انتہائی ڈانٹ ہے۔ آگے کہتا ہے فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

تُكَذِّبٰنِ ۝ تم دونوں۔ اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ پھر فرمایا يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۝ تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا اور کوئی تمہارا مددگار نہیں ہوگا۔ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ" تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔" يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ "مجرمین جہنم اور گرم پانی کے درمیان پھرتے پھریں گے۔ پھر کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نعمتیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ عذاب ہیں۔ لیکن ان کو نعمتوں کی فہرست میں بیان کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کو حق ہے کہ جو چاہے سو کہے اور جو چاہے سو کرے۔ اس کے فعل سے سوال نہیں کیا جا سکتا۔ لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ اب ذرا غور کرو کہ جن لوگوں کو اجازت دی تھی اگر وہ اس اذنِ نبی و اجازت نبی پر عمل نہ کرتے تو یہ سب مجرم ہو جاتے۔ اب اگر عمل کر لیا تو نبی کی اطاعت ہوگئی اور نبی کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۝ تو گویا نبی نے ان کو اجازت دیکر اللہ کی اطاعت کرائی۔ اب خود ہی اپنی اطاعت پر وہ کہہ رہا ہے کہ تو نے کیوں میری اطاعت کرائی۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ وہ جو چاہے سو کرے اور جو چاہے کہے۔ کُل کلاں اس کو حق ہے۔ اب یہاں ایک نکتہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جب گمراہی کرانے کی اور اضلال کی نسبت اللہ اور رسول کی طرف ہو تو اضلال کی نسبت اللہ کی طرف کرنے یا ماننے سے ایمان میں کوئی خرابی نہیں آئے گی۔ البتہ رسول کی طرف ایسی نسبت کرنی کفر ہوگی۔

کیونکہ خود اللہ تعالےٰ نے اضلال کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور نبی کی طرف کسی جگہ بھی اضلال کی نسبت نہیں کی۔ بلکہ ہدایت کی نسبت کی ہے۔ اِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ بے شک تو سیدھے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔ اِنَّكَ

لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (ومن لیقنت۔ یٰسٓ) بے شک تو رسولوں میں سے ہے۔ سیدھے رستے پر ہے۔ خود سیدھے راستے پر ہے۔ اللہ کی شان یہ ہے کہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے سیدھے رستے دکھاتا ہے تو اضلال کی نسبت اللہ کی طرف غلط نہیں ہے اور نبی کی طرف غلط ہے۔ کفر ہے۔

سوال: اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے۔ اگر یہ وحی تھی تو پھر زید نے کیوں نہیں اس پر عمل کیا؟

جواب: یہ وحی تھی۔ لیکن صیغۂ امر جس طرح وجوب کے لئے آتا ہے۔ اسی طرح اور بہت سے معنی کے لئے آتا ہے۔ یہاں وجوب کے لئے نہیں ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا۔ جب تم احرام سے باہر ہو جاؤ تو شکار کرو۔ یہ صیغۂ امر ہے۔ مگر وجوب شکار کے لئے نہیں ہے۔" وَمَنْ شَاۤءَ فَلْيَكْفُرْ" یہ صیغۂ امر ہے۔ وجوب کے لئے نہیں ہے۔ یعنی جو چاہے کفر کرے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفر واجب ہے۔ بلکہ تہدید ہے۔ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ جو چاہو کرو۔ یہ سب امر کے صیغے ہیں مگر وجوب کے لئے نہیں ہیں۔ اسی طرح اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ کا صیغہ امر وجوبی نہیں ہے۔ جو اس پر عمل نہ کرنے سے مخالفتِ رسول لازم آئے۔

سوال: منکرینِ حدیث نے اسی صفحہ ۵۹ پر کہا ہے۔" مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى " کے کیا معنی ہیں۔؟

جواب: اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارا صاحب اپنی خواہش سے نہیں بولتا جو کچھ بولتا ہے۔ یعنی اس کا بولنا صرف وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔ کیونکہ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ میں " هُوَ" کی ضمیر کا مرجع اوپر لفظاً مذکور نہیں ہے۔ کیونکہ اوپر صرف تین لفظ ہیں۔ نجم، صاحب اور ہویٰ، اور یہ تینوں وحی نہیں ہیں لہذا ھو کا مرجع معناً" ینطق" میں نطق ہے۔ لہذا

آیت اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ کے معنی ہوئے کہ تمہارے صاحب کا نطق صرف وحی ہی ہے نہیں ہے تمہارے صاحب کا نطق مگر وحی۔ یہاں نطق نبی کو وحی کہا ہے۔ اور قرآن نطقِ نبی نہیں ہے۔ اور جو کوئی قرآن کو نطق نبی کہے وہ کافر ہے کیونکہ قرآن تو نطق باری تعالیٰ ہے اور اس آیت میں وحی نطق نبی کے لئے ثابت ہے۔ لہٰذا نطق نبی وحی ہے۔ نبی کے تمام اقوال وحی ہیں۔ اس کے بعد میں کہتا ہوں ذرا آگے چل کر فرمایا: فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی اس نے اپنے بندے کو وحی کی جو وحی کرنی تھی۔ آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ جو وحی اپنے بندے کو کی تھی یعنی "مَآ اَوْحٰی" یہ قرآن کی کونسی آیت ہے۔ اب اگر وحی صرف قرآن ہی ہوگا تو بتاؤ کہ یہ "مَآ اَوْحٰی" کی وحی قرآن میں کس جگہ ہے۔ کیونکہ "فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی" یہ آیت حکایت ہے اس وحی سے جس کو "مَآ اَوْحٰی" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ بولو کیا کہتے ہو۔ یہ وحی قرآن میں ہے۔ تو بتاؤ کہ کون سی آیت ہے۔ یا کون سی آیتیں ہیں۔ آج تک کوئی مفسر کوئی عالم یہ نہیں بتاسکا۔ اور نہ بتا سکتا ہے کہ یہ وحی فلاں آیت یا آیتیں ہیں۔ کیونکہ قرآن معین ہے اور یہ وحی مبہم ہے۔ لہٰذا معلوم ہوگیا یہ وحی قرآن سے باہر ہے۔ اور یہی وحی غیر قرآن ہے۔ ہم پوچھتے ہیں۔ نبی کا قول وحی ہے یا نہیں۔ اگر کہو کہ وحی ہے تو بے شک حق ہے یہی ہماری مراد ہے اگر کہو کہ نہیں ہے تو بولو کیا کہتے ہو جس وقت نبی نے کہا کہ یہ کتاب یا یہ آیات یا یہ سورت مجھ پر نازل ہوئی ہے۔ آیا یہ قول نبی کا ماننے کے قابل ہے یا نہیں۔ اگر کہو ماننے کے قابل ہے تو ٹھیک ہے بس یہی معنی نبی کے قول نبی کی حدیث کے حجت ہونے کے ہیں۔ لہٰذا حدیث نبی حجت ہوگئی اگر کہو کہ یہ قول ماننے کے قابل نہیں ہے تو حدیث کے ساتھ قرآن بھی گیا۔ نہ حدیث رہی نہ قرآن رہا۔ نہ دین نہ اسلام کافر ہونے کے ساتھ ساتھ مجنوں بھی ہوگئے۔ خدا کے قہر سے ڈرو۔ کیوں دین کو تباہ کر رہے ہو۔

سوال ۳ ۔ منکرینِ حدیث نے صفحہ ۶۰ پر کہا ہے وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی

بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَاَظْھَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ عَرَّفَ بَعْضَہٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّاَھَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَکَ ھٰذَا قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ۔ اور جب نبی نے چپکے سے اپنی کسی بیوی سے ایک حدیث بیان کی۔ پھر اس بیوی نے اس کو کسی اور سے کہہ دیا اور اللہ نے آپ کو اس سے آگاہ کر دیا۔ آپ نے کچھ بات اس بیوی سے کہی اور کچھ سے اعراض کیا۔ پھر جب نبی نے بیوی کو اس بات پر آگاہ کیا تو بیوی بولی آپ کو اس کی کس نے خبر دی۔ آپ نے فرمایا مجھے علیم وخبیر نے خبر دی۔ اس آیت کے دونوں ٹکڑے وَاَظْھَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ اور نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ قرآن شریف سے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی ہوتی۔

سوال یہ ہے کہ منکر حدیث نے کہا ہے کہ اَظْھَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ یعنی اللہ نے نبی پر اس کو ظاہر کر دیا اور نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ علیم وخبیر نے مجھے آگاہ کر دیا۔ ان دونوں ٹکڑوں میں یعنی اللہ کے ظاہر کرنے اور علیم وخبیر کے آگاہ کرنے میں اس بات پر دلالت نہیں ہے کہ یہ اظہار اور آگاہی وحی کے ذریعہ ہو بلکہ یہ اظہار اور آگاہی ایسی ہے کہ جیسے اللہ نے تم کو کتوں کے سُدھارنے کی تعلیم دی ہے اور جس طرح تم کو کتوں کو سُدھارنے کی تعلیم دینا وحی نہیں ہے اسی طرح نبی پر اس واقعہ کا اظہار اور ابناء وحی نہیں ہے۔ اور جس طرح اللہ نے فرمایا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اور جس طرح یہ انسان کی تعلیم وحی نہیں ہے اسی طرح نبی پر اللہ کا اس واقعہ کو ظاہر کرنا اور علیم وخبیر کا نبی کو آگاہ کرنا بھی وحی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟

جواب: بالکل غلط ہے۔

انسان کو دو چیزیں دی گئی ہیں۔ ایک تو علم کی فعلیت اور ایک علم کی قابلیت فعلیت کے یہ معنی ہیں کہ جس وقت انسان اپنے حواس کو محسوسات کی طرف متوجہ کرے تو

فوراً اس کو ان محسوسات کا شعور، ادراک، احساس، علم ہو جائے اس کو بدیہی علم کہتے ہیں۔ دوسری چیز قابلیت ہے۔ استعداد ہے۔ صلاحیت ہے۔ یہ چیز صرف حواس کی توجہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ یعنی جس علم کی قابلیت دی ہے وہ صرف حواس کی توجہ سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد، کوشش، اکتساب، غور و فکر کرنا پڑتا ہے۔ اس علم کو نظری علم کہتے ہیں۔ ہر انسان کی فطرت میں نظری علم کی قابلیت اور بدیہی علم کی فعلیت اللہ تعالٰے نے رکھی ہے۔ اور انبیاء کو جو علوم دیئے جاتے ہیں وہ ان دونوں علموں سے ممتاز ہوتے ہیں انہی کو وحی کہا جاتا ہے اس لئے نبی من حیث النبی کا علم عام انسانوں جیسا نہیں ہوتا۔ نبی کا علم خدا کا کلام خدا کی خبر خدا کا قول سننا ہوتا ہے۔ اور خدا کا بشر سے کلام کرنا ہی وحی ہے۔ اللہ تعالٰے نے فرمایا۔ "مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ" اللہ تعالٰے بشر سے جب کلام کرتا ہے تو صرف ان تین طریقوں سے۔ وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا اپنا ایک پیغامبر بھیجتا ہے۔ وہ اللہ کی اجازت سے اللہ کی منشار کے مطابق وحی کر دیتا ہے۔ اور یہ تینوں طریقے وحی ہیں۔ پہلی وحی یعنی وَحْيًا ظاہر وحی ہے اور مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ جیسے حضرت موسیٰ سے پس پردہ کلام کیا تھا۔ یہ بھی وحی ہے فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى اے موسیٰ جو وحی ہو رہی ہے اس کو سن۔ تیسرے طریقہ میں بھی یوحیٰ کا لفظ موجود ہے۔ الغرض نبی کا علم اللہ کا کلام کرنا ہے اور اللہ کا نبی سے کلام کرنا یہ وحی ہے۔ لہٰذا نبی کا علم وحی ہے لہٰذا جب بھی اللہ نبی کو کوئی بات بتائے گا وہ وحی ہوگی۔ اور وہ وحی کے ذریعہ ہوگی۔ بدیہی اور نظری علوم کے ذریعہ نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان دونوں کے ذریعہ تو عام انسانوں کو تعلیم کر دی ہے اور اگر نبی کو بھی ان ہی دونوں ذریعوں سے تعلیم کرتا تو عام انسانوں سے نبی فائق نہ ہوتا نیز نبی اور غیر نبی کا فرق اس طرح بتایا۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى

اِلَيَّ۔ "میں تمہارے جیسا آدمی ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مجھ پر وحی ہوتی ہے تو وحی عام انسانوں کے علوم بدیہیہ اور نظریہ سے ممتاز چیز ہوگئی لہٰذا جب بھی اللہ نبی کو خبر دے گا وہ وحی ہوگی۔ جب بھی اللہ نبی پر کوئی شے ظاہر کرے گا وہ وحی ہوگی۔ جب بھی اللہ نبی کو آگاہ کرے گا وہ وحی ہوگی۔ ورنہ عام انسانوں سے نبی ممتاز نہیں ہوگا۔ اور پھر نبوت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ اس کے علاوہ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالٰے نے فرمایا۔ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا (وما من دابة۔ هود) یہ غیب کی خبریں ہیں جن سے ہم نے وحی کے ذریعہ تجھے آگاہ کیا اس سے پہلے نہ تو جانتا تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ غیب کی خبریں بغیر وحی کے نہیں معلوم ہو سکتیں اور یہ جو بیوی نے افشار راز کیا اور نبی نے فوراً ہی بیوی کو آگاہ کیا۔

یہ نبی کا آگاہ کرنا غیب کی خبر ہے اور غیب کی خبر بغیر وحی کے نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اللہ نے جو ظاہر کیا نبی پر اور علیم و خبیر نے جو آگاہی نبی کو دی یہ وحی تھی۔ دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کا اپنی بیوی کو آگاہ کرنا غیب کی خبر ہے اور غیب کی خبر دینی وحی ہے۔ لہٰذا نبی کا اپنی بیوی کو آگاہ کرنا وحی ہے۔ دیکھو نبی نے اپنی بیوی سے ایک بات کہی۔ پھر جب اس بیوی نے وہ بات دوسرے سے کہہ دی۔ یہ شرط ہے اور اس کی جزا ہے۔ عَرَّفَ بَعْضَهٗ۔ یعنی کچھ حصہ بات کا نبی نے بیوی کو جتلایا اور اس شرط و جزا کے بیچ میں " وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ " آگیا ہے۔ یعنی اللہ نے نبی پر ظاہر کر دیا یعنی ادھر بیوی نے افشار راز کیا ادھر نبی نے باظہار الٰہی بیوی کو جتلایا یعنی بیوی کے افشار راز کرتے ہی نبی نے بیوی کو جتلایا۔ اب اللہ کہتا ہے فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ " جونہی نبی نے بیوی کو آگاہ کیا بیوی کو سخت تعجب ہوا کہ ابھی راز فاش کرتے کچھ دیر نہیں گذری ان کو کیسے معلوم ہو گیا اور کہا کہ آپ کو کس نے بتایا۔ آپ نے فرمایا علیم و خبیر نے۔ اس آیت کے اگلے پچھلے ٹکڑے

کو ملاتے ہی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اِدھر افشاء راز ہوا اُدھر باظہارِ الٰہی نبی نے بیوی کو جتلایا۔ لہذا بیوی کے افشاء راز کی خبر بیوی کو دینی غیب کی خبر ہے اور غیب کی خبر بغیر وحی ناممکن ہے لہذا اظہارِ الٰہی وحی ہے۔

سوال (نمبر ۳ کا دوسرا جز وصٰ ۶۱) کیا علیم وخبیر غیر اللہ ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ منکرِ حدیث نے کہا ہے۔

جواب: ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ واقعہ ایک ہی ہے۔ ایک ہی واقعہ کے لئے "اَظْهَرَ" آگیا اور اسی واقعہ کے لئے "نَبَّاَ" آیا۔ تو آگاہ کرنے والا اور ظاہر کرنے والا ایک ہوا اور ظاہر کرنے والا اللہ ہے۔ تو آگاہ کرنے والا بھی اللہ ہی ہوا۔ اور آیت میں آگاہ کرنے والا علیم وخبیر ہے۔ تو معلوم ہو گیا کہ علیم وخبیر اللہ ہی ہے۔

سوال: منکرینِ حدیث نے جو اپنے رسالہ طلوع اسلام بابت جون ۱۹۵۶ء صفحہ ۶۲ کے شروع میں کہا ہے کہ یاد رکھیے حضرات انبیاء کرام کی طرف جو وحی آتی تھی اس کا تعلق انسانوں کی ہدایت سے ہوتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ بات صحیح ہے یا غلط؟

جواب: غلط ہے۔ دیکھو "وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ" (ومامن دابۃ۔ ھود) نوح کی طرف یہ وحی ہوئی کہ تیری قوم میں سے اب کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ بجز ان کے جو ایمان لا چکے۔ اب دیکھو یہ وحی ہے اور کوئی تعلق اس وحی کو ہدایت سے نہیں ہے۔ کیونکہ اس وحی کے وقت تو ہدایت سے مایوسی ہو چکی۔ لہذا یہ کہنا کہ وحی ہدایت کے لئے ہوتی ہے یہ غلط ہے بلکہ وحی کبھی ہدایت سے مایوسی کے لئے بھی ہوتی ہے۔ اور ذرا آگے بڑھو "وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا" ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہماری وحی سے کشتی بنا۔ یہ وحی لوگوں کی ہدایت کے لئے نہیں تھی بلکہ کشتی بنانے کے لئے تھی۔ اور اس وحی کو کتاب کہنا بھی جہالت ہے۔

سوال: منکرِ حدیث نے صفحہ ۶۲ پر کہا ہے۔ چونکہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا قرآن میں کہیں حکم نہیں ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی غیر قرآن سے بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا۔

اس کا تحقیقاتی جواب منکرِ حدیث نے دیا ہے کہ بیت المقدس کو اس آیت کی رو سے قبلہ بنایا گیا ہے۔ "اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ" ان حضرات انبیاء کو اللہ نے ہدایت کی ہے۔ اے نبی ان کی ہدایت کی اقتدا کر اور چونکہ بیت المقدس ان حضرات کا قبلہ رہا ہے اس لئے آپ نے بحکم اس آیت کے اس کو قبلہ بنایا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ جواب صحیح ہے یا غلط ہے۔

جواب: یہ جواب بالکل غلط ہے۔ کیونکہ یہ آیت اور سورۃ مکّی ہے۔ اگر یہ آیت بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا سبب ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ ہی میں نماز کے وقت بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے۔ لیکن جب تک حضور مکہ میں رہے کعبہ ہی کو قبلہ بنایا دیکھو۔ "اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی" کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جو بندہ کو یعنی تجھ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔ یعنی ابوجہل حضور کو جب وہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے روکتا تھا اس سے صاف ظاہر ہے کہ مکہ میں آنحضرت کعبہ کی طرف رُخ کیا کرتے تھے اور آیت "اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ" مکی ہے اگر یہ آیت قبلہ بنانے کی موجب ہوتی تو مکہ ہی میں بیت المقدس قبلہ بن جاتا لہذا ظاہر ہو گیا کہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے کے لئے مدینہ جا کر کوئی اور وحی ہوئی جس کی رو سے بیت المقدس قبلہ بنایا گیا اور وہ وحی قرآن میں قطعاً مذکور نہیں ہے۔ یہاں ایک اور بات سمجھو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کافی مدت مکّہ میں مقیم رہے اور شروع ہی سے کعبہ کو قبلہ بنایا۔ بتاؤ کہ کعبہ کو قبلہ شروع میں کس وحی سے بنایا تھا۔ قرآن سے یا وحی غیر قرآن سے۔ قرآن میں تو شروع میں قبلہ بنانے کا کوئی حکم ہے نہیں۔ لہذا وحی غیر قرآن سے بنایا تھا۔ یاد رکھو شروع میں

وحی غیر قرآن سے قبلہ بنا پھر وحی غیر قرآن سے بیت المقدس بنا۔ پھر تیسری مرتبہ قرآن سے کعبہ قبلہ بنا لہٰذا منکر حدیث کا جواب بالکل غلط اور غیر تحقیقی ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کو غور سے سمجھ لو کہ آیت "اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ" میں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء کی ہدایت کی اقتدا کا حکم دیا گیا ہے وہ شرائع میں نہیں ہے۔ کیونکہ نبی کریم تو تمام شرائع کے ناسخ ہیں۔ اقتدا ایمانیات اور اخلاقیات میں ہے۔

سوال ۵ منکرین حدیث نے صفحہ ۶۲ پر کہا ہے۔ سورۂ حشر میں ہے کہ تم نے جو درخت کاٹ دیئے وہ باذنِ الٰہی کاٹے اور قرآن میں یہ اذن نہیں ہے۔ قرآن سے علیحدہ یہ اذن ہوا تھا۔ اور یہی وحی غیر قرآن ہے۔ اس کا جواب منکرین حدیث نے دیا ہے کہ اذنِ خداوندی قرآن میں موجود ہے اور وہ یہ ہے "اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا" جن لوگوں پر ظلم کیا گیا ہے انہیں جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جواب صحیح ہے یا غلط ہے؟

جواب: یہ جواب بالکل غلط ہے کیونکہ آیت سے صرف لڑائی کی اجازت ثابت ہوتی ہے۔ کھیتی اور ہرے بھرے باغوں کے کاٹنے کی اجازت ثابت نہیں ہوتی۔ اور اگر درختوں کے کاٹنے کی بھی اجازت اس آیت سے ثابت ہوتی تو تمام درخت کاٹ دئے جاتے حالانکہ ایسا نہیں ہوا کچھ کاٹے گئے کچھ چھوڑے گئے۔ نیز کھیتی کے برباد کرنے کی اللہ تعالیٰ نے مذمت کی ہے۔ "وَیُهْلِكَ الْحَرْثَ" کھیتی کو وہ ہلاک کرتا ہے۔ یہ کھیتی کے برباد کرنے کی مذمت ہے۔ اب اگر درخت برباد کئے جائیں گے تو جدید وحی سے ہی کئے جائیں گے لڑائی کی اجازت درختوں کے کاٹنے کی اجازت ہرگز نہیں بن سکتی۔

سوال (۳ کا تیسرا جزو ص۶۱) منکرین حدیث نے بالآخر اسی رسالہ میں اس بات کو تسلیم کرلیا[1] کہ حضور پر قرآن کے علاوہ ایسی وحی ہوتی تھی جس کا تعلق حضور

[1] اس حوالہ کے لئے دیکھو طلوع اسلام بابت جون ۵۷ء ص۶۱

کی ذات سے ہوتا تھا۔ ہدایت سے نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ وحی ایسی ہوتی تھی جیسے نحل (شہد کی مکھی) کی طرف ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ صحیح ہے کہ حضور پر وحی قرآن کے علاوہ جو ہوتی تھی وہ مثل شہد کی مکھی کے ہوتی تھی۔

جواب: یہ بات غلط ہے کہ حضور پر مثل شہد کی مکھی کے وحی ہوتی تھی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ" اللہ بشر سے صرف ان تین ہی طریقوں سے کلام کرتا ہے (۱) وحی سے "وحی سے" کے یہ معنے ہیں کہ نبی کے دل میں معنی ڈال دیتا ہے اور نبی اپنے الفاظ میں ان معنیٰ کو ادا کر دیتا ہے (۲) وحی پس پردہ سے' یہ اس طرح ہوتی ہے کہ الفاظ نبی کو سنائی دیتے ہیں اور اللہ دکھائی نہیں دیتا (۳) یُرْسِلَ رَسُوْلًا سے مراد یہ ہے کہ اللہ کا فرشتہ اللہ کا پیغام لے کر آتا ہے اور وہ نبی کے سامنے پڑھتا ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد پھر نبی پر وحی ہوتی ہے جو "اِلَّا وَحْیًا" میں وحی ہے۔ اس وحی کے ذریعہ اس فرشتہ کی وحی کی تفسیر اور تشریح کی جاتی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے۔ "فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ" جب ہم اس کی قرأت کریں تو اس کی اتباع کر یعنی سُنتا رہ "ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ" پھر ہمارے ذمہ ہے اس کا بیان کرنا اور واضح کرنا۔ یہ بیان قرآن منجانب اللہ ہے۔ اور یہ بیان قرآن قرآن نہیں ہے کیونکہ اگر یہ بیان قرآن قرآن ہوگا تو پھر اس قرآن کے لئے بیان ہوگا۔ اور اسی طرح سلسلہ لامتناہی جائے گا اور تسلسل محال ہے۔ لہٰذا یہ بیان غیر قرآن ہے۔ جس کو اللہ فرماتا ہے کہ ہمارے ذمہ ہے۔ یعنی ہم بعد میں وحی غیر قرآن سے قرآن کو بیان کر دیں گے اور سمجھا دیں گے۔ گذشتہ صفحات میں اس کی تفصیل لکھی جا چکی ہے۔ لہٰذا انبیاء کو صرف انہی تین طریقوں سے وحی ہوتی ہے۔ شہد کی مکھی کی طرح نہیں ہوتی۔ کیونکہ شہد کی مکھی کی فطرت ایسی کر دی ہے جس طرح وہ تمام امور کو انجام دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کو باشعور طور پر وحی ہوتی ہو اور وہ اپنے شعور سے ان

چیزوں کو انجام دے کیونکہ وہ ایسی ایسی عجیب و غریب اور محکم اشکال ہندسیہ بناتی
ہے کہ بڑے سے بڑا مہندس ریاضی داں حیران رہ جاتا ہے۔ اگر اس کا یہ فعل باشعور ہوگا
تو وہ انسان سے افضل ہو جائے گی۔ لہٰذا اس کی وحی باشعور نہیں ہے اور نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کی وحی **باشعور** ہے۔ لہٰذا حضور کو کوئی وحی شہد کی مکھی جیسی نہیں ہوئی۔ اب
تم اس مثال سے سمجھ لو۔ "قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ
أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ" "کہہ دے مجھ سے کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنی طرف سے اس
میں تبدیلی کر دوں میں تو صرف وحی کا تابع ہوں جو میری طرف ہوتی ہے اب نبی اکرم صلی
اللہ علیہ وسلم نے جو سورتیں مکہ میں نازل ہوئی تھیں اور پہلے نازل ہوئی تھیں ان کو قرآن
میں پیچھے اور آخر میں اور بعد میں لکھوایا اور جو مدینہ میں بعد میں نازل ہوئی تھیں جیسے سورۂ
بقرۃ وغیرہ ان کو اول میں لکھوایا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے تبدیلی
نہیں کر سکتے وہ تو صرف وحی کے تابع ہیں اور وحی قرآن میں کہیں تبدیل کرنے کا حکم نہیں ہے
اس سے صاف واضح ہو گیا یہ وحی کہ جس وحی کے ذریعہ ان سورتوں کی تقدیم تاخیر ہوئی ہے
یہ قطعاً قرآن سے علیحدہ ہوئی اور چونکہ یہ قرآن جو ہمیں پہنچا ہے اس میں قطعاً تقدیم و تاخیر
ہے اور یہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے اس سے پتہ چل گیا کہ وحی غیر قرآنی بھی ہدایت کے لئے
ہے۔ ہم گذشتہ صفحات میں اس کی کافی تشریح کر چکے ہیں۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ یہ جو دو فرض
صبح کو مسلمان پڑھتے ہیں اور چار ظہر کے وقت اور چار عصر کے وقت اور تین مغرب کے وقت
اور چار عشاء کے وقت یہ تعداد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کی ہے یا انہوں نے مقرر
نہیں کی۔ اگر کوئی کہے کہ انہوں نے مقرر نہیں کی تو وہ کافر ہی نہیں مجنون بھی ہے۔ اور اگر کہے
کہ نبی نے مقرر کی ہے تو بولو نبی نے اپنی رائے سے مقرر کی ہے یا وحی سے مقرر کی ہے۔ اگر کہو اپنی
رائے سے تعداد مقرر کی ہے تو ساری دنیا کا مسلمان ہر زمانہ کا مسلمان یہ جانتا ہے کہ نبی نے قوم
سے یہ کہا کہ نماز اللہ نے فرض کی ہے تو اس صورت میں نبی "وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ

الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ (تبارک الذی
الحاقۃ) کی وعید میں آجائے گا تو سارے عالم کے مسلمان متفق ہیں کہ نبی نے اللہ کی طرف کوئی
بات ایسی منسوب نہیں کی جو اللہ نے اس سے نہ کہی ہو اور اگر وحی سے یہ تعداد مقرر کی ہے تو
یہی وہ وحی ہے جس کو ہم نے ثابت کیا۔ یہی وحی غیر قرآن احادیث ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ نبی
بغیر وحی کے نمازوں کی تعداد مقرر نہیں کر سکتا تھا۔ اور یہ تعداد قرآن میں مذکور نہیں ہے تو لا بد
قرآن کے علاوہ وحی ہوئی اور اس وحی سے یہ تعداد مقرر ہوئی۔

سوال ۶ منکر حدیث نے ص ۶۳ پر کہا ہے کہ کتاب اور حکمت ایک ہی چیز
ہے کیا یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟

جواب: یہ بات غلط ہے۔ کتاب اور حکمت ایک چیز نہیں ہے اس لئے کہ
کتاب یقینی اور قطعی طور پر صرف نبی ہی کو ملی۔ یعنی جس انسان کو اللہ نے کتاب دی وہ یقیناً
نبی ہے اور جس انسان کو حکمت دی ضروری نہیں ہے کہ وہ قطعاً نبی ہو کیونکہ تمام مسلمانوں
کا اجماع ہے کہ لقمان کی نبوت مقطوع نہیں ہے یعنی لقمان کی نبوت قطعی اور یقینی نہیں ہے۔
حکمت لقمان مقطوع ہے اور قطعی ہے۔ "وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ" ہم نے
لقمان کو حکمت دی اس دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر کتاب اور حکمت ایک ہی چیز ہوگی تو جس
کو حکمت ملی قطعاً اس کو کتاب ملی اور جس کو کتاب ملی قطعاً وہ نبی اور رسول ہے۔ اور لقمان
کو حکمت ملی تو گویا کتاب ملی اور جس کو کتاب ملی وہ قطعاً نبی ہے تو لقمان قطعاً نبی ہونے چاہئیں
حالانکہ قوم کا اجماع ہے کہ وہ نبی مقطوع نہیں ہے اس کے بعد ہم کہتے ہیں کہ کتاب ہدایت
ہے نور ہے اور خیر محض ہے یعنی خیر ہی خیر ہے۔ لہٰذا کتاب اللہ خیر ہی خیر ہے۔ خیر محض ہے اور
حکمت خیر محض نہیں ہے بلکہ خیر کثیر ہے۔ "وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا
كَثِيرًا" جس کو حکمت ملی اس کو خیر کثیر ملا۔ تو معلوم ہو گیا کہ حکمت خیر کثیر ہے اور کتاب خیر
محض اور کل کا کل خیر ہے۔ اور خیر محض خیر کثیر کا غیر ہے۔ لہٰذا کتاب و حکمت میں عینیت

نہیں ہے۔

(سوال ۶ کا دوسرا جز) منکرِ حدیث نے صـ۶۴ـ پر کہا ہے کہ " ذٰلِكَ مِمَّآ اَوۡحٰۤى اِلَيۡكَ رَبُّكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ " یہ جو کچھ اوپر قرآن بیان کیا گیا ہے یہ حکمت ہے۔ اس آیت سے کتاب اور حکمت کی عینیت ثابت کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس آیت سے عینیت ثابت ہوتی ہے یا نہیں ؟

جواب: نہیں۔ کیونکہ من ما اوحی میں جو من ہے وہ تبعیض کا ہے اور من الحکمۃ میں من ما اوحیٰ کا بیان ہے اسکے یہ معنی ہوئے کہ یہ حکمت میں سے ہے اور حکمت کا بعض ہے اس سے ثابت ہو گیا کہ حکمت قرآن کے باہر بھی وحی غیر قرآنی میں ہے۔ کیونکہ ذٰلِكَ مِنَ الۡحِكۡمَةِ اور چیز ہے اور ذٰلِكَ الۡحِكۡمَةِ اور چیز ہے اور نیز اس آیت میں بھی اشارہ وحی غیر قرآنی کی طرف موجود ہے۔ یعنی جو وحی غیر قرآنی تیری طرف تیرے رب نے کی ہے اس کا یہ یعنی وحی قرآنی بعض ہے کیونکہ ذٰلک کا اشارہ اوپر وحی قرآنی کی طرف ہے۔

سوال: منکر حدیث نے صـ۶۴ـ پر کہا ہے۔ کتاب اور حکمت کے ایک ہونے پر اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ وَمَآ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهٖ اگر کتاب اور حکمت دو چیزیں ہوتیں تو بجائے بِهٖ کے بِهِمَا ہوتا چونکہ واحد کی ضمیر لائی گئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکمت ایک چیز ہے سوال یہ ہے کہ یہ استدلال صحیح ہے یا غلط ہے؟

جواب: غلط ہے بہ کی ضمیر کل واحد منہما کی طرف پھر رہی ہے جس طرح وَاللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَحَقُّ اَنۡ يُّرۡضُوۡهُ میں واحد کی ضمیر کل واحد منہما کی طرف یعنی اللہ اور رسول میں سے ہر ایک کو خوش رکھیں اب اگر واحد کی ضمیر سے دونوں کے ایک ہونے پر استدلال کیا جائے گا تو اللہ اور رسول ایک ہو جائیں گے لہذا يَعِظُكُمۡ بِهٖ کے معنی يَعِظُكُمۡ بِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ کے ہیں۔ اور بالکل اس کی ایسی ہی مثال ہے اِسۡتَجِيۡبُوۡا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاكُمۡ یہاں بھی واحد کی ضمیر ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ اللہ اور رسول میں سے ہر ایک بلائے کیونکہ اللہ بھی داعی ہے۔ وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡۤا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ۔

———— x ————

منکرِ حدیث
اور
قربانی

از علامہ محمد ایوب صاحب

پیش لفظ

"فتنۂ انکارِ حدیث" اور "تحقیق الکلام" جیسی بلند پایہ علمی تصانیف کی اشاعت کے بعد رسالۂ ہٰذا کے مصنّف علامہ محمد ایوب صاحب کا نامِ نامی و اسمِ گرامی علمی حلقوں میں کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کے تبحر اور وسعتِ علمی کا اندازہ کچھ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جنہوں نے علامہ موصوف کی کسی تصنیف کو پڑھا، یا آپ کو کسی اعلیٰ علمی مجلس میں غامض ترین مسائل کلامیہ پر نکتہ سنج پایا ہو۔ باریک عقلی استدلال کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث کا برجستہ استعمال، فلسفیانہ موشگافیوں کے دوش بدوش محسوسات ومشاہدات کا حسین امتزاج، یہی علامہ موصوف کی وہ عظیم خصوصیت ہے جس میں اگر ان کو منفرد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ موصوف کا طرزِ بیان سیدھا سادہ، خالص علمی اور تحقیقی ہے۔ دورِ جدید کی خطابت، انشاء پردازی اور الفاظ کی سحر کاری سے قطع نظر ممدوح کے بیان میں جو حقیقت کا نورِ ہدایت کی روشنی نظر آتی ہے، وہ شاید ہی کہیں اور میسّر ہو۔

فتنۂ انکارِ حدیث دورِ حاضرہ کا عظیم فتنہ ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ اس کا موقفِ علمی زیادہ مستحکم ومضبوط ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ اپنے مقصد کے اعتبار سے یہ فتنہ دہریت اور کمیونزم کا ہم آہنگ ہے۔ اس فتنۂ عظیم کے رد میں حضرت علامہ کی نادر تصنیف "فتنۂ انکارِ حدیث" یہ ادارہ شائع کرچکا ہے۔ کتاب "فتنۂ انکارِ حدیث" میں حضرت علامہ نے جس مدلّل اور انوکھے طریقے سے منکرینِ حدیث کا رد فرمایا، اور جس مسکت انداز میں ان کے ملحدانہ خیالات کا استیصال کیا ہے، اس کی مثال نہیں سو صفحات کی یہ ضخیم کتاب ہزارہا کی تعداد میں نہ صرف کراچی بلکہ پورے پاکستان میں مفت تقسیم ہوچکی ہے اور ہنوز سلسلۂ تقسیم جاری ہے۔

ادارہ کوشاں ہے کہ ہر پڑھے لکھے مسلمان کے ہاتھ میں یہ کتاب پہنچ جائے تاکہ مفسدین اپنے ناپاک ارادوں میں ناکام ہوں۔ اور ملتِ اسلامیہ ان کے شر سے محفوظ رہے۔

زیرِ نظر کتاب "منکرِ حدیث اور قربانی" اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔

اس کے متعلق صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ یہ رسالہ حضرت علامہ کی اس مدلّل تقریر کا خلاصہ ہے جو سوال مذکورۃ الصدر کے جواب میں اہلِ علم کے ایک منتخب مجمع کے سامنے کی گئی۔ چونکہ مولانا کی اس تقریر کا عنوان تھا "منکرِ حدیث اور قربانی" اس لئے ادارے نے فیصلہ کیا کہ اس تقریر کو اسی نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تاکہ عامۃ المسلمین اس سے بہرہ ور ہوں اور ان کو معلوم ہوجائے کہ تخریبی عناصر پس پردہ کیا کر رہے ہیں۔

یہاں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ فتنۂ انکارِ حدیث پر حضرت ممدوح کی متعدد تصانیف ادارہ ہٰذا کے پاس بغرضِ اشاعت موجود ہیں۔ انشاء اللہ مناسب وقت آنے پر یہ سب یکے بعد دیگرے آپ کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ جملہ مسلمانوں کو فہمِ سلیم عطا فرمائے اور ملحدین و مفسدین کے شر سے عامۃ المسلمین کو محفوظ رکھے آمین۔

ادارہ

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

سوال

منکرین حدیث کے مرکز " ادارہ طلوع اسلام " لاہور نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ان لوگوں نے " قرآنی فیصلے " رکھا ہے۔ اس کتاب کے صفحے ٥٧ پر مذکور ہے:-

" یہ جو ہم بقر عید کے موقعہ پر ہر شہر اور ہر قریہ ہر گلی اور ہر کوچہ میں بکرے اور گائیں ذبح کرتے ہیں، یہ قرآن کے کس حکم کی تعمیل ہے؟ قرآن میں اس کے متعلق کوئی حکم نہیں، یہ ایک رسم ہے جو ہم میں متوارث چلی جا رہی ہے۔"

اسی کتاب کے صفحہ ٦٣ پر منکرِ حدیث نے کہا ہے:

" سارے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی نہیں لکھا کہ مکّہ کے علاوہ کسی اور جگہ بھی قربانی دی جائے گی۔"

اسی صفحے پر بزعم خود محققانہ انداز میں کہا گیا ہے:

" یہ کچھ ہزار برس سے ہوتا چلا آرہا ہے اور کوئی اللہ کا بندہ اتنا نہیں سوچتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔"

اس کے بعد صفحہ ٦٥ پر انکشاف کیا گیا ہے:

" خود رسول اللہ نے بھی مدینہ میں قربانی نہیں دی۔"

پھر اپنی گمراہ کن کوششوں کی تکمیل اس طرح کی گئی ہے:

" ہر جگہ قربانی دینا نہ حکمِ خداوندی ہے، نہ سنّتِ ابراہیمی اور نہ ہی سنّت محمدی۔"

سوال یہ ہے کہ منکرِ حدیث کی مندرجہ بالا تصریحات کی حیثیت کیا ہے؟

جواب

منکرِ حدیث کا بیان قطعاً غلط ہے۔ اس کا یہ کہنا کہ قرآن میں کہیں قربانی کا حکم نہیں۔ اور یہ کہ سارے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی نہیں لکھا کہ مکّہ کے علاوہ کسی اور جگہ بھی قربانی دی جا سکتی ہے۔ سرتاپا غلط اور گمراہ کن ہے۔ قرآن کریم ایک جامع کتاب ہے اور اس میں صراحتہً یہ بات مذکور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ منکرِ حدیث کو بنا بر بے بضاعتی و نظر نہ آئی ہو۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (اقترب للناس) "(ہم نے ہر امّت کے لئے قربانی مقرر کی ہے، تاکہ وہ اللہ کا نام لیں ان چوپائے جانوروں پر جو اُس نے اُن کو دیئے ہیں)"

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ہر امّت میں قربانی موجود تھی۔ تفصیل یہ ہے کہ ہر اُمّت کے لئے رسول ثابت ہے۔ جیسا کہ فرمایا وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ"۔ تو جتنے رسول ہوئے اتنی ہی اُمّتیں ہوئیں۔ بالفاظِ دیگر دنیا میں جہاں جہاں رسول آئے وہاں اُمّتیں تھیں۔ لہٰذا جہاں جہاں اُمّتیں تھیں، وہاں چوپایوں کی قربانی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اُمّتیں نہ صرف مکہ بلکہ تمام روئے زمین پر آباد تھیں، اور قربانی (جیسا کہ آیت مذکورہ سے ظاہر ہے) ہر امّت پر مقرر تھی، تو معلوم ہوا کہ قربانی تمام روئے زمین پر ہوتی تھی۔ لہٰذا منکرِ حدیث کا یہ کہنا کہ قرآن میں کہیں قربانی کا حکم نہیں اور یہ کہ سارے قرآن میں کسی جگہ بھی مذکور نہیں کہ مکّہ کے علاوہ کسی اور جگہ بھی قربانی دی جا سکتی ہے۔ نہ صرف گمراہی بلکہ بے بضاعتی علم کی بین دلیل ہے۔ علاوہ ازیں قربانی کو حج یا حاجی، کعبہ یا مکّہ کے ساتھ مختص کرنا بھی درست نہیں، کیونکہ کعبہ کی تعمیر سے قبل دنیا میں امّتیں موجود تھیں، اور جہاں جہاں امّتیں موجود تھیں وہاں قربانی تھی (جیسا کہ آیت سے ظاہر ہے) لہٰذا قربانی کو حج یا حاجی، کعبہ یا مکہ کے ساتھ مختص کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہاں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امتوں پر جو قربانی مقرر کی ہے وہ (جیسا کہ مندرجہ بالا آیت سے ظاہر ہے) رسولوں ہی کے واسطے سے کی اور رسولوں نے بحکم خداوندی اپنی اپنی امتوں کو وہ قربانی سکھائی۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو قربانی کی ہدایت کی اور رسولوں نے (حسب ہدایت خداوندی) اپنی اپنی امتوں کو اس قربانی کی ہدایت کر دی۔ اس طرح قربانی (بحکم آیۃ کریمہ) تمام رسولوں کی سنت قرار پائی۔ لہٰذا منکرِ حدیث کا یہ قول کہ "نہ سنتِ ابراہیمی ہے نہ سنتِ محمدی"، قطعاً غلط ہے، کیونکہ یہ تو خدا کی طرف سے ہر امت پر مقرر کی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ امت کو صرف رسول ہی بتا سکتا ہے۔ لہٰذا یہ قطعاً ہر رسول کی سنت ہے۔ اب دیکھئے قرآن کریم میں وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ سے وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ تک رسولوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ یعنی یہ جتنے رسول ہیں اللہ سے ہدایت پائے ہوئے ہیں۔ اے رسول تو ان کی پیروی کر۔ چونکہ ہدایت خداوندی (جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا) متضمن قربانی ہے، لہٰذا پیرویٔ انبیاء سابقین کا متضمنِ قربانی ہونا قطعاً ثابت ہے۔ معلوم ہوا قربانی حکمِ خداوندی ہے، سنتِ رسل ہے اور سنتِ محمدی ہے۔ نظر بایں منکرِ حدیث کا یہ کہنا کہ قربانی نہ حکمِ خداوندی ہے نہ سنت ابراہیمی اور نہ سنتِ محمدی، یہ بالکل غلط اور گمراہ کن ہے۔ کیونکہ قربانی (جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا) حکم خداوندی بھی ہے اور تمام رسولوں کی سنت بھی، لہٰذا یہ حکم خداوندی ہونے کے ساتھ ساتھ سنتِ ابراہیمی بھی ہے اور سنتِ محمدی بھی۔

علاوہ ازیں منکرِ حدیث نے کہا ہے کہ قربانی ایک رسم ہے جو ہزار برس سے رائج ہے۔ اس کے متعلق قارئین کرام کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ اسی قسم کی دیگر خرافات صرف اس لئے کی جا رہی ہیں کہ عامۃ المسلمین کو صحیح راستے سے بیزار کر دیا جائے تاکہ رفتہ رفتہ وہ الحاد اور دہریت کی طرف بآسانی مائل ہو سکیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر قربانی محض ایک رسم یا بدعت ہوتی اور دین نہ ہوتی (جیسا کہ منکرِ حدیث کا خیال ہے) تو ابتدائے رواج ہی سے اس میں اختلاف ہوتا جیسا کہ خلقِ افعالِ عباد، مرجئہ اور امامت کے مسائل میں رونما ہوا۔ حالانکہ تواتر سے ثابت ہے کہ قربانی کے مسئلہ میں کسی زمانے میں بھی اختلاف نہیں ہوا۔ یہ کیسی قربانی کی رسم تھی، یہ کیسی قربانی کی بدعت تھی کہ سارے جہان کے مسلمانوں نے بلا اختلاف اس کو اپنا لیا اور دین قرار دے دیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دین میں کسی رسم یا نئی بات کے پیدا ہوتے ہی اختلاف ہوا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی رسم بدعت یا نئی بات دین میں پیدا ہوئی ہو اور سارے عالم کے مسلمان بلا اختلاف اس پر متفق ہو گئے ہوں۔ چونکہ قربانی ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر تمام مسلمان بلا کسی اختلاف متفق رہے ہیں، اس لئے یہ رسم، بدعت نہیں بلکہ دین ہے اور یہی وجہ ہے جو شہر شہر قریہ قریہ بلکہ گھر گھر رائج ہے۔ لہٰذا منکرِ حدیث کا یہ کہنا کہ یہ ایک رسم ہے، قطعاً غلط اور بعید از فہم ہے۔

اب رہا منکرِ حدیث کا یہ قول کہ قربانی (محض) ہزار سال سے رائج ہے، تو اس کی رکاکت ظاہر ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر قربانی محض ایک رسم یا بدعت ہوتی اور صرف ہزار سال سے ہوتی چلی آتی، تو ان ہزار سال سے پہلے تین سو ستر سالہ دور میں قطعاً اس کا ذکر تک نہ ہوتا۔ حالانکہ اس ہزار سالہ دور سے قبل کی تصنیفات میں یہ مضمون موجود ہے۔ بخاری کی کتاب اور مؤطا امام مالک دونوں اس ہزار سالہ دور سے پہلے کی کتابیں ہیں اور قربانی کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ یہ استدلال کتب احادیث پر مبنی ہے اور منکرِ حدیث کتبِ احادیث کا قائل ہی نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ منکرِ حدیث خواہ ان کتابوں میں مندرجہ احادیث کو مانے یا نہ مانے، یہاں اس سے بحث ہی نہیں۔ بحث تو یہ ہے کہ یہ کتب دوسری اور تیسری صدی میں تالیف ہوتی ہیں اور ان میں قربانی کے مضمون

کا ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ زمانۂ تالیف سے قبل اور زمانۂ تالیف میں قربانی کا ذکر اور چرچہ موجود تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ قربانی ایک رسم ہے جو ہزاروں سال سے رائج ہے قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ بخاری میں مندرجہ حدیث منکرِ حدیث کے نزدیک غلط ہو یا صحیح، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ کتاب ہزار برس سے قبل کے دور میں تالیف ہوئی۔ لہٰذا اس میں مندرجہ احادیثِ قربانی ہزار برس سے پہلے کی قرار پائیں۔ یہی دلیل ہے اس بات کی کہ قربانی اس ہزار سالہ دور سے پہلے دور میں موجود تھی اب اگر یہ قربانی رسم و بدعت ہوتی اور سنّت و دین نہ ہوتی، تو یقیناً اس میں اختلاف ہوتا اور وہ اختلاف منقول بالتواتر ہوتا۔ حالانکہ اسکے برعکس قربانی بر اتفاق منقول بالتواتر ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ سنّت ہے اور دین ہے دیکھئے عیدالاضحیٰ کی نماز منقول بالتواتر ہے اور دین ہے۔ بعینہٖ اسی طرح نماز بعد قربانی منقول بالتواتر ہے اور دین ہے جس ذریعہ سے عیدالاضحیٰ کی نماز کا دین ہونا منقول ہے، اُسی ذریعہ سے نماز کے بعد قربانی کا دین ہونا منقول ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ منکرِ حدیث کا یہ کہنا کہ قربانی ہزار سالہ پیداوار یا بدعت ہے بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ کیونکہ تقریباً بارہ سو سال کی جتنی پیداواریں یا بدعات ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ مثلاً تشیع، خروج، اعتزال، ارجاء وغیرہ سب ہزار سال سے پہلے کی چیزیں ہیں اور سب جانتے ہیں کہ یہ بدعات ہیں، یعنی اِن کا بدعات ہونا منقول بالتواتر ہے۔ اسی طرح اگر قربانی بھی کوئی رسم، بدعت یا نئی پیداوار ہوتی تو یقیناً اس میں اختلاف ہوتا اور وہ اختلاف منقول بالتواتر ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے معلوم ہوا قربانی کوئی رسم، بدعت یا نئی پیداوار نہیں بلکہ دین ہے اور اِس کا دین ہونا اسی طرح بلا اختلاف منقول بالتواتر ہے جس طرح نمازِ عیدالاضحیٰ کا دین ہونا۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ قربانی کا بلا اختلاف منقول بالتواتر ہونا اس بات کا مقتضی نہیں ہے کہ قربانی دین ہو۔ ہو سکتا ہے کہ سارا عالمِ اسلام کسی لادینی چیز پر متفق ہو جائے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ لادینی چیز دینی چیز بن جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قربانی کا بلا اختلاف منقول بالتواتر ہونا قطعاً اس بات کا مقتضی ہے کہ قربانی دین ہو، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو پھر قرآن بھی قابلِ وثوق نہیں رہے گا اور اس کی حیثیت بھی مشتبہ ہو جائے گی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ منکرِ حدیث کہتا ہے کہ قربانی محض ہزار سال سے رائج ہے اس سے پہلے یہ نہ تھی، لہٰذا یہ دین نہیں ہے۔ منکرِ حدیث کا یہ قول (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا) قطعاً غلط اور گمراہ کن ہے، کیونکہ اوّل تو قربانی کو ہزار سالہ قرار دینا ہی غلط ہے جبکہ اس کا ثبوت ہزار سال سے قبل کی کتب سے ملتا ہو۔ دوسرے یہ کہ اگر قربانی ہزار سالہ رسم یا بدعت ہو جیسا کہ منکرِ حدیث کا خیال ہے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سارا عالمِ اسلام ایک لادینی امر پر بلا اختلاف متفق ہو گیا (کیونکہ قربانی بلا اختلاف منقول بالتواتر ہے) اس صورت میں حیثیتِ قرآن بھی مشتبہ ہو جائے گی۔ کیونکہ جب سارا عالمِ اسلام یعنی جملہ مسلمانانِ عالم ایک لادینی امر پر بلا اختلاف متفق ہو گئے تو ان کی یہ نقل کہ "یہ قرآن قرآن ہے" کیسے اور کیونکر قابلِ قبول ہوگی! بالفاظِ دیگر جب سارا عالمِ اسلام قربانی پر (جو بقول منکر ایک لادینی امر ہے) بلا اختلاف متفق ہو گیا، تو ہو سکتا ہے کہ اس بات پر بھی متفق ہو جائے کہ غیر قرآن کو قرآن بتا دے اور اس طرح قرآن بھی ہزار سال سے غلط نقل ہوتا چلا آیا ہو!

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سارا عالمِ اسلام کسی لادینی چیز کو دین قرار نہیں دے سکتا اگر سارا عالمِ اسلام کسی لادینی چیز کو دین قرار دے سکتا ہو۔ تو اس وقت سارے عالم اسلام کی بات غیر معتبر اور غلط ہو جائے گی۔ اور جب سارے عالم اسلام کی بات غیر معتبر اور غلط ہو تو پھر قرآن بھی غیر معتبر اور غلط ہو سکتا ہے کیونکہ قرآن بھی اسی عالمِ اسلام کی نقل پر موقوف ہے۔ لیکن عند الفریقین قرآن معتبر ہے، تو معلوم ہوا جس جماعت نے بالتواتر قرآن نقل کیا ہے وہ جماعت قابلِ اعتبار ہے۔ بنا بریں جس جماعت کے اعتبار پر قرآن

کو قرآن تسلیم کیا ہے، اس جماعت کے اعتبار پر قربانی کو دین تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے؟
اب رہا منکرِ حدیث کا یہ قول کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قربانی نہیں کی تو اس کے متعلق میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ میں نماز عید الاضحیٰ ادا کرنا اور نماز کے بعد قربانی کرنا تواتر سے ثابت ہے، یعنی جس طرح نمازِ عید الاضحیٰ تواتر سے ثابت ہے۔ بعینہٖ اسی طرح قربانی بعد از نماز بھی تواتر سے ثابت ہے۔ نظر بایں اس قول کی رکاکت اہل علم سے مخفی نہیں۔

اس کے علاوہ میں اس سلسلے میں پوچھتا ہوں بتاؤ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں نماز عید الاضحیٰ پڑھی یا نہیں؟ دو ہی صورتیں ہیں یا پڑھی یا نہیں پڑھی۔ اگر کہو نہیں پڑھی، تو پھر یہ نماز عید الاضحیٰ کہاں سے آئی۔؟ حج کے بعد منیٰ میں تو نماز عید الاضحیٰ ہوتی ہی نہیں، پھر یہ رسم نماز عید الاضحیٰ کدھر سے آئی؟ اگر کہو پڑھی، تو جس طرح اور جس ذریعے سے نماز عید الاضحیٰ کا مدینہ میں پڑھنا ثابت ہے، بالکل اسی طرح اور اُسی ذریعے سے قربانی بعد از نماز ثابت ہے۔ لہٰذا قربانی کو حدیث سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں، جس طریقے سے نماز عید الاضحیٰ ثابت ہے اور دین ہے۔ اُسی طریقے سے قربانی بعد از نماز ثابت ہے اور دین ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ قربانی کوئی رسم یا بدعت نہیں بلکہ ایک دینی امر ہے اور قرآن سے ثابت ہے جیسا کہ فرمایا وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ۔ یہ اجماع سے بھی ثابت ہے، کیونکہ اگر اس پر اجماع نہ ہوتا (یعنی تمام مسلمان اس پر متفق نہ ہوتے) تو یقیناً اختلاف ہوتا اور وہ اختلاف یا کلیتہً ہوتا یا جزئیتہً (کلیتہً کے معنی یہ کہ کوئی بھی قربانی کو دین نہ مانتا اور جزئیتہً کے معنی یہ کہ کچھ لوگ اس کو دین مانتے اور کچھ نہ مانتے) بہرصورت وہ اختلاف منقول بالتواتر ہوتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس تیرہ سو سالہ دور میں کسی نے بھی عید الاضحیٰ

کی نماز کے بعد قربانی سے اختلاف نہیں کیا۔ معمولی معمولی اختلاف برابر منقول ہوتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن "قربانی بعد از نماز عید الاضحیٰ" کے متعلق کوئی اختلاف منقول نہیں۔ معلوم ہوا یہ ایسی ہی متفق علیہ ہے جیسی نماز عید الاضحیٰ۔ اس پر ایسا ہی اجماع ہے جیسا نماز عید الاضحیٰ پر۔ یہ رسم بدعت نہیں بلکہ ایک دینی چیز ہے۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے کیا۔ تابعین و سلف صالحین نے کیا۔ اور بعد ازاں آج تک یہ متوارث و متواتر چلی آرہی ہے۔ کسی زمانے میں اس پر اختلاف نہیں ہوا۔ کسی دور میں یہ غیر شرعی یا لادینی امر قرار نہیں پائی۔ یہ نہ رسم ہے نہ بدعت ہے نہ فضول خرچی ہے نہ اسراف بیجا ہے جو لوگ اس کو ایسا سمجھتے ہیں یقیناً وہ منافق ہیں۔

واللہ یشھد ان المنافقین لکذبون

فغانِ قرآن

الحاج مولوی عزیز الحق صاحب مرحوم ریٹائرڈ ڈپٹی سکریٹری حکومتِ پاکستان

جلسوں میں سنایا جاتا ہوں ٹیپوں میں بجایا جاتا ہوں
لہروں پہ اڑایا جاتا ہوں جب نشر کرایا جاتا ہوں

تقریب کوئی جب ہوتی ہے وہ دین کی ہو یا دنیا کی
آغاز مجھ ہی سے ہوتا ہے پھر خوب بھلایا جاتا ہوں

مکتب ہی تلک محدود نہیں تعلیم مری تدریس مری
اب کالج و یونیورسٹی میں معنوں سے پڑھایا جاتا ہوں

الفاظ کو میرے علامہ پہناتے ہیں کچھ ایسے معنیٰ
جبرئیل امیں لائے نہ جسے مضمون وہ بنایا جاتا ہوں

بوبکرؓ و عمرؓ سمجھے نہ جسے عثمانؓ و علیؓ پہنچے نہ جہاں
اسرار و معارف کے ایسے زینہ پہ چڑھایا جاتا ہوں

تصدیقِ رسولِ برحق کی مقصد تھا مرا غایت تھی مری
اب تو قولِ نبیؐ کو جھٹلانے کے کام میں لایا جاتا ہوں

جب کوئی مفکر مغرب کا دنیا سے نرالی بات کہے
تائید کرانے کو اس کی فوراً میں بلایا جاتا ہوں

جو اپنے من کو بھاتی ہیں پڑھتے ہیں وہی آیات مری
اک رُخ سے دکھایا جاتا ہوں اِک رُخ سے چھپایا جاتا ہوں

امداد تو مجھ سے لیتے ہیں ہر یہ نہیں یکسر چھا جاؤں
اِک بار جگایا جاتا ہوں اِک بار سلایا جاتا ہوں

قرآنِ عزیز اس طرح کرے فریاد و فغاں اللہ اللہ
عرقِ ندامت عرقِ ندامت میں تو نہایا جاتا ہوں

فتنہ انکارِ حدیث

مؤلفہ

امام المتکلمین و محققین علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی قدس اللہ سرہ

ناشر

مکتبہ رازی ۱۵ شہاب مینشن محمد بن قاسم روڈ
کراچی ۱